خلوت کی انجمن

یعنی

چند دلاویز شاعرانہ مضامین

از

مسز حجاب امتیاز علی
(حجاب اسمٰعیل)
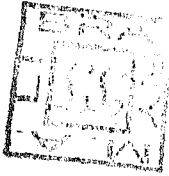
سنہ ۱۹۳۶ء

دارالاشاعت پنجاب لاہور
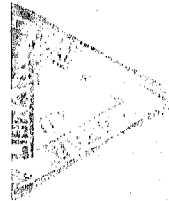
اباجان

شمس العلما مولوی سیّد ممتاز علی صاحب مرحوم ومغفور

کے نام

فہرست مضامین

۷

ہر ایک کا نیا سال

"جب نیا سال شروع ہوتا ہے۔ تو پرانے ارمان زندہ ہو جاتے ہیں۔ اور خیال پرست روح خلوت میں چلی جاتی ہے"۔

(حکیم عمر خیام) ——— (یکم جنوری) ———

آج دوپہر . . . آج یکم جنوری کی دوپہر میں قبرستان جانے کے خیال سے مکان کا دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ تو سامنے سینٹ اینڈروز کے گرجا کے احاطہ میں مجھے ایک خوش پوش نظر آیا جس کے چہرے پر نئے سال کی بے ساختہ مسکراہٹوں اور پرکیف آرزوں کا ایک سمندر موجزن تھا۔ اس کے سیاہ کوٹ کے کاج میں ڈاٹ کا نازک پھول دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا۔ کہ یہ شخص زندگی کی تمام کلفتوں

اور دنیا کی ساری ناکامیوں کو باسی سال کے ساتھ رخصت کر کے گرجا
سے واپس آ رہا ہے!! دو گھڑی میری مظلوم نظریں اُس کے بشاش
چہرے پر پھرتی رہیں ۔ ۔ ۔ پھر مجھے ایک لمبے سرد سانس کے ساتھ
احساس ہوا کہ یہ ہوتا ہے ایک بے فکرے کا نیا سال ۔ ۔ !!
کچھ دیر بعد مجھے وہ بلند اور وحشت ناک سیاہ دروازہ نظر آیا۔
جس سے ہماری اس فانی زندگی کو ایک ابدی رشتہ ہے ۔ اور
جسے نئے سال کے مسرور دن غافل انسان ایک نظر دیکھنا پسند
نہیں کرتا ۔ اور جس کے اندر میرے رفیق ۔ ۔ ۔ آہ وہی رفیق جن
سے صرف دو لمحہ گفتگو کرنا کبھی میرے لئے عین سبب حیات تھا ۔
آج دائمی سکوت میں کھوئے ہوئے وزنی پتھروں کے نیچے مجبور
پڑے ہیں! یادِ رفتگاں نے مجھے بے چین کر دیا۔ میں دیوانہ وار کچھ
دیر اپنے ہمیشہ کے بچھڑے ہوؤں سے باتیں کرتی رہی پر آہ ۔ ۔
اے میری تقدیر!! وہ سب کے سب کسی پُراسرار راگ کے سننے
میں محو معلوم ہوتے تھے۔ مجھے محسوس ہوا۔ کہ اس پُراسرار سرزمین نے
اپنے اندر سینکڑوں شاعروں۔ دنیا کے بڑے بڑے ناموروں مشہور
نقادوں۔ بہادر سپاہیوں۔ بدطینت ڈاکوؤں، رہزنوں اور قزاقوں
کو چھپا رکھا ہے اور ان کے نیک و بد اعمال کا ایک گیت بنا کر

دھیمے دھیمے گا رہی ہے، پر میرے ضمیر کے کان اتنے تیز نہیں کہ اس گیت کے مفہوم کو سمجھ سکیں!

میں بار بار اپنے اُن مدّت کے بچھڑے ہوؤں کو مخاطب کرتی تھی، جن کے چہرے کبھی دن رات میرے پیشِ نظر رہا کرتے تھے اور جن کو وقت۔ تقدیر۔ اور موت کے ہولناک پردے نے اب ہمیشہ کے لئے نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔ اور جن کو پھر ایک دفعہ ایک نظر دیکھنے کی آرزو میں میرا دل۔ کمزور اور غمزدہ دل دھڑک دھڑک کر ساکت ہو رہا تھا اور ساکت ہو ہو کر دھڑک رہا تھا۔ اور جن کی آواز سننے کے لئے میرا ضمیر بے چین اور آرزومند ضمیر بچے کی طرح مچل مچل کر رو رہا تھا اور رو رو کر مچل رہا تھا!

پھر وہ وقت آیا۔ کہ میری روح کی تمام کوششیں رائگاں گئیں اور میں نے کسی کی آواز نہ سنی۔ کسی کا چہرہ نہ دیکھا۔ سوائے اس کے کہ میری بدنصیب آنکھیں اُن قبروں کے وزنی پتھروں پر جمی رہیں۔ جن کو وقت کے مضبوط ہاتھوں نے شکستہ کر دیا تھا!

کھلے ہوئے نیل گوں آسماں پر مشرقی ممالک کا گرم بڑا سا ایشیائی آفتاب بڑی تیزی سے چمک رہا تھا۔ اور غمگین بھورے پتھروں پر زرد گلاب کی پتیاں منتشر تھیں! . . . آخر لانگ فیلو

کا وہ مقولہ مجھے یاد آیا!۔

"عالم ہستی ہے بیداری ۔۔۔ قبر نہیں ہے غایت اس کی
مٹی ہے تو مٹی میں ملے گا ۔۔۔ روح کی جانب کب ہے اشارہ"

پھر میں اس پر اسرار زمین سے باہر نکل آئی ۔ آہ یہ تھا سا کنان عالم ارواح کا نیا سال ۔ ۔ ۔ !!

فاربوس کے پل پر مجھے بس۔ موٹر کاریں۔ ٹریم ٹیکسی۔ اور مختلف وضع کی گاڑیاں آتی جاتی چلتی پھرتی نظر آئیں ۔ سمندر کی مچھلیوں کی طرح جو اپنی خوراک کے لیئے لہروں میں سرگرداں پھرتی ہیں۔ لوگ ان گاڑیوں میں فاربوس کے گھوڑ دوڑ کے میدان کو جارہے تھے اور دولت کمانے کی حرص میں ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے گاڑیوں سے اُتر چڑھ رہے تھے + ان کی نظروں میں دولت کے سنہرے سنہرے انبار روپوں کے اونچے اونچے ڈھیر غول بیابانی کی طرح ناچ رہے تھے اور اُن کی روح کے کان روپوں کی کھنا کھن سننے کے مشتاق تھے ۔ ان میں بعض فاربوس کے میدان سے واپس آرہے تھے بعض جارہے تھے ۔ بعض خوش قسمت اپنی ان تھیلیوں کو سنبھال سنبھال کر رکھ رہے تھے جو پہلے ہلکی تھیں اور جنہیں قسمت نے بعد میں وزنی بنا دیا تھا ۔ مگر بعض اُن

تھیلیوں پر کفِ افسوس مل رہے تھے جو پہلے وزنی تھیں - مگر بعد میں تندبر نے اُنہیں ہلکا بنا دیا تھا +

میں ایک طرف کو چُپ چاپ کھڑی دیوانوں کی طرح ۔۔۔ ہاں بالکل پاگلوں کی طرح مخلوق کی ان سرگرمیوں کو دو گھڑی دیکھتی رہی - اس وقت مجھے احساس ہُوا کہ یہ ہوتا ہے دنیا پرستوں کا نیا سال !! ۔۔۔ !

جب میں انسانوں کے اس جیتے جاگتے سمندر کی موجوں سے بچ کر بہ مشکل ولنگٹن کے قریب پہنچی - تو وہاں مجھے فوجی باجے کے سُریلے مگر غمناک سروں نے بیتاب کر دیا + سیاہ گھوڑوں والی سیاہ اُونچی سی گاڑی اپنی پُشت پر ایک نوجوان خوشرو فوجی کو اٹھائے قبرستان کی طرف لے جا رہی تھی - اس کے ساتھ لوگ ماتمی لباس میں اور مذہبی انداز میں گفتگو کرتے چلے جا رہے تھے - ایسا معلوم ہوتا تھا - کہ وہ سب کے سب معبود کے کئے پر صبر کرنے کی مشق کر رہے ہیں - آہ! وہ کونسی حسرت نصیب روح ہے - جو نئے سال کے تیئے دان - نئی دنیا میں بسنے کے لئے جا رہی ہے - !!! بلند آسمان !! کون سی روح ؟ ۔۔۔ !

او خدا! یہ ہوتا ہے ایک بہادر سپاہی کا نیا سال ۔۔۔ !!

پھر ہیری سن ہوٹل کے سامنے ایک تنگ و تاریک گلی میں کھڑ کے کُتوں کے پہلو بہ پہلو گرد و غبار میں لپٹا ہوا مجھے ایک کوڑھی فقیر نظر آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اُس کی روح کو جسم سے۔ اور جسم کو روح سے ایک نفرت ہے۔ یہاں میں نے دیکھا کہ سینکڑوں موٹر کاریں گاڑیاں اور بے شمار خواتین و حضرات اُس کے پاس سے نکل جاتے تھے۔ پر کسی کے دل میں یہ احساس نہ تھا۔ کسی کے خیال میں یہ بات نہ آتی تھی کہ وہ ایک محتاج ہاتھ کو تھامتے!

جہاں وہ نئے سال کی نئی شام۔ اپنی نئی نئی مسرتوں میں مخمور اور مصروف ہیں۔ وہاں ایک معذور مجبور انسانی زندگی پر دو لمحہ غور کرتے! پر آہ . . . ان کے پاس اس کے لئے سوائے ایک نگاہِ حقارت اور کراہیت کے کچھ نہ تھا! . . آہ کمبخت دنیا! بے وفا دُنیا . . . ! کبھی ہم اسی طرح . . . اسی معذور حالت میں اپنے کسی دوست کے پاس جائیں اور وہ ہمارا ہاتھ تھامنے سے اِنکار کر دے ہم سے کنارہ کشی کر لے!

آہ . . . یہ ہوتا ہے ایک اپاہج کا نیا سال . . . !!

مجھے ریپن بلڈنگس کے پاس پھر انسانوں کا ایک دریا لہریں مارتا نظر آیا . . . خوش مزاج اور زندگی کے احساسات سے

لبریز نوجوان مرد اور عورتیں نئے سال کی شام کے خوبصورت فراک شالیں۔ اور قیمتی کوٹ رنگ برنگ کی نکٹائیاں پہنے متبسم چلتے پھرتے نظر آرہے تھے۔ بلند معبود! کیا واقعی یہ آدم و حوّا کی دنیا مسرتوں اور جگمگاہٹ سے لبریز ہے؟ اور اگر واقعی یہ سچ ہے تو کیسی اچھی بات ہے! ۔ ۔ ۔ !

میں دیکھ رہی تھی۔ کہ ان میں سے بعض کے چہرے چاند کی طرح دل کش اور گلاب و شبو کی طرح سُرخ و سفید تھے۔ پر آہ! ۔ ۔ ۔ ان کے دل زمین کی طرح سخت اور رات کی طرح سیاہ تھے! مجھے محسوس ہوا کہ ان میں کسی ایک کے دل میں بھی مخلوق کے لئے ہمدردی موجود نہ تھی! وہ عالی شان دوکانوں کی بیش قیمت کرسیوں پر بیٹھ کر اپنے دوستوں۔ دولت مند اور عالی مرتبت دوستوں کی چائے کی پیالیوں اور نفیس شراب کی بوتلوں سے خاطر تواضع کر رہے تھے۔!

یہ تھا اُن غافلوں کا نیا سال ۔ ۔ ۔ !!

اس وقت مجھے ٹھیکرے کا یہ مقولہ یاد آرہا تھا:۔

"ایسے لوگ دنیا میں جیتے اور پھولتے پھلتے ہیں! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو بے وفا اور بے فیض ہیں۔ اور جن سے کسی

قسم کی نیک امید نہیں! پیارے دوست آ کہ ہم اپنی
پوری طاقت سے ان پر حملہ آور ہوں"

شام کے وقت جب میں مکان کو لوٹی۔ تو میرے مطالعہ کے
کمرے کی میز پر بتی چراغ کھلے آسمانی رنگت کے ساٹن کے فانو
میں بیمار کی زندگی کی طرح ٹمٹمار رہا تھا۔ میرے احساسات مضمحل اور
جذبات دن بھر کے واقعات سے بڑے بے چین معلوم ہوتے
تھے۔

اس شام مجھے کیٹس کے "بلبل" ملٹن کی "کھوئی ہوئی جنت" اور
ارسطو کے فلسفے سے ایک اکتاہٹ سی محسوس ہو رہی تھی عمر خیام
کی شراب بھی مجھے مخمور نہ کر سکی! . . . میں نے ایک کتاب اٹھا
لی . . . پر اے معبود! صفحۂ قرطاس پر حروف شیطان کے
قدموں کی طرح ناچتے نظر آئے۔

میں میز کے پاس سے کتابوں کے انبار کو چھوڑ کر ہٹ گئی
مجھے ان موٹی موٹی جلدوں سے وحشت محسوس ہونے لگی۔ جن
میں علم و فن کے دریا لہریں لے رہے تھے۔ کیونکہ . . . ان
میں کوئی بات ایسی لکھی ہوئی نہیں تھی جو مخلوق . . . معذور
مخلوق سے ہمدردی کرنا سکھاتی! . . . ان میں حسن و عشق

کے رومان تھے سائنس کے جدید تجربات تھے۔ فلسفے کی ذہین بحثیں تھیں ۔ ۔ ۔ سب بے فائدہ۔ فضول ۔ ۔ ۔ مہمل ۔ ۔ ۔ انسان کو انسان کا ہمدرد بنانے والا کوئی نسخہ دریچ نہ تھا! میں نے ایک آہ بھری ۔ ۔ ۔ پھر میں دریچے کے آگے ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی + دور جنا کی میانہ قد جھاڑیوں کے پیچھے نئے سال کا سورج دم توڑ رہا تھا! اور مجھے ہواؤں میں عمر خیام کی روح کی آواز اس طرح آ رہی تھی:-

"نیا سال پرانی یادوں کو زندہ کر دیتا ہے اور ہماری روح گذرے ہوئے دنوں کی طرف اڑ جاتی ہے"۔

یہ تھا میرا نیا سال ۔ ۔ ۔ !!

سردی کی ایک صبح

صفحۂ زندگی کی مٹی مٹائی سطور

سردی کی صبح تھی!

کیپا میں سردیوں کا بہت لطف آتا ہے۔ دن بھر نیلگوں چشم بلبل آفتاب کی سنہری روشنیوں میں حسن و عشق کی راگنیاں الاپا کرتی تھی۔ اور ہم دونوں ایک بے خودی کے عالم میں اس کو ایک متبسمانہ انداز میں سنا کرتی تھیں۔ آہ! کیسے فردوسی دن تھے۔

صبح ہی صبح تھوڑی دیر کے لئے برف باری بھی شروع

ہو گئی تھی۔ سرد ہوائیں چل رہی تھیں جنگل کے درخت رات کی سردی سے ابھی تک گیلے گیلے معلوم ہوتے تھے۔

میں اور جسوتی صبح کا منظر دیکھنے کے لیئے اپنے کمروں میں گرم کوٹ پہن کر برآمدے میں نکل آئیں۔

اس صبح مجھے اپنی سہیلی کا چہرہ قوس و قزح کی مانند رنگین معلوم ہو رہا تھا۔ مجھے آج تک اس کے وہ شگفتہ جملے نہیں بھولے اس نے اس وقت کہا تھا۔

"سلام شوق! کیسی دل فریب اور زندگی بخش صبح ہے سردی بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ تم پسند کرو۔ تو ہم چائے برآمدے میں پئیں!"

جسوتی کی ایسی شاعرانہ باتوں سے مجھے عشق تھا۔

تھوڑی دیر میں ہماری بوڑھی خادمہ اپنی موٹی کمر ہلاتی ہوئی چائے کی کشتیاں لے آئی۔ جسوتی کو بچپن سے میرے بعض فقروں پر ہنس پڑنے کی عادت تھی۔ اس وقت بھی وہ ہنس رہی تھی اس خوش گوار صبح کو (آہ وہ بچھڑی ہوئی صبح!) جسوتی کی ہنسی کی آواز بہت ہی دل کش اور سریلی ہو گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے صحن فردوس میں ہنس مکھ فرشتے ارغنوں بجا رہے

ہیں۔

سورج نکل آیا۔ سامنے پہاڑی پر برف پگھل رہی تھی۔ شمشاد کے درخت پہاڑی سرد ہواؤں سے جھوم رہے تھے۔ اور سرخ گلاب کے چہرے شدت سردی سے مدھم ہو رہے تھے۔

جسونتی کا محبوب کتا کوزی دھوپ تاپ رہا تھا۔ اور اس کا طوطا آفتابی گرمی اپنے پروں میں پہنچا رہا تھا۔ مگر بلیاں سردی کو ناپسند کرتی ہیں۔ اس واسطے میری بلی میرے بستر پر ابھی تک ایک کشمیری شال میں لپٹی لپٹائی سو رہی تھی۔ میں نے اس کو ایک ٹکڑا دودھ میں بھگو کر کھلا دیا تھا۔ بے چاری بلی کیباس کی سرد ہوا سے بیمار ہو گئی تھی۔ نزلے میں مبتلا تھی۔

جسونتی اس وقت کافی کے رنگ کے ایک اونی کوٹ میں بہت بھلی لگتی تھی۔ اس کی سفید پیشانی پر سردی کے نشانات تھے۔ خادمہ نے اس کی سیاہ زلفوں کو ایک سنہرے فیتے سے باندھ دیا۔ اس وقت وہ ایک سرخ سیب چھیل رہی تھی مگر وہ ان دنوں اس قدر نزاکت شعار ہو گئی تھی۔ کہ آسٹریلیا کے اس رسیلے پھل کو بھی بہ مشکل چھیل سکتی تھی۔ محنت اور

سردی سے اس کے ہاتھ برف کی مانند سفید ہو گئے تھے!

اس صبح کو گذرے۔ آج کئی سال کا عرصہ ہو گیا۔ پر واقعات بدستور میرے دل پر نقش ہیں۔ آہ۔ صفحۂ زندگی کے وہ مٹنے مٹائے حروف! سہ

گذاری ہیں خوشی کی چند گھڑیاں۔
انہیں کی یاد میری زندگی ہے!

دیوانہ

آمادۂ صحرا ہے طبیعت کئی دن سے
پھر ہاتھ ہیں دلدادۂ وحشت کئی دن سے
تڑپاتی ہے رہ رہ کے یہ وحشت کئی دن سے

وہ بے تحاشہ ویرانوں میں گھومتا نکل جاتا ہے۔
ویران گلیوں میں وہ کتّوں کے ساتھ گھنٹوں کھیلا کرتا ہے۔
اس کی باتوں پر لوگ ہنستے ہیں۔ اور وہ لوگوں کی باتوں پر
ہنستا ہے۔
مجھے دیوانوں سے ہمیشہ ایک دلچسپی رہی ہے۔ دیوانے

بجائے خود ایک دل چسپ معمہ ہوتے ہیں۔ ان کی پراسرار زندگیوں سے مجھے ایک خاص دل بستگی ہے*

مجھے ایک دیوانہ کا حال معلوم ہے۔ کہ مسرت دن رات اس کے گرد ناچا کرتی تھی۔ رات کے وقت وہ گھنٹوں آسمان کے تاروں کو گھورا کرتا۔ جیسے وہ انہیں توڑنے کی تجویزیں کر رہا ہو اور تدبیر سوچ رہا ہو*

خزاں کی دوپہر میں جب زرد اور خشک پتیاں جنگل میں ہوا کے ساتھ اڑتیں۔ تو وہ بھی ان کے ساتھ بھاگتا ہوا دور تک نکل جاتا۔ دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا۔ جیسے وہ ان زرد پتیوں سے زندگی کے کسی اہم راز کو دریافت کرنے کا خواہش مند ہے جو اس سے اب تک پوشیدہ ہے*

بعض اوقات وہ خود ہی کھلکھلا کر ہنس پڑتا۔ اس کی آواز اس قدر مسرور اور دلکش ہوتی۔ کہ سننے والے کو دھوکا ہوتا۔ کہ خوابوں کے جزیرے میں پانی برس رہا ہے! او بلند معبود!

کبھی کبھی وہ بیٹھے بیٹھے اٹھتا۔ اور چراغ کی طرف دوڑ کر جاتا اسے پھونکیں مار مار کر بجھا دیتا۔ اور اپنی اس حرکت پر اس قدر بلند قہقہہ لگاتا۔ کہ فضا گونج اٹھتی+ ایسا معلوم ہوتا کہ کائنات اک

گہوارہ ہے جو انبساط کے جھونکوں سے ہل رہا ہے! مقدس آسمان!!

ایک دفعہ اس نے کئی ایک ردّی کاغذوں کو مروڑ لیا اور پھر انہیں پتنگ کی طرح آسمان کی طرف اُڑا کر اس قدر خوش ہُوا۔ کہ گھنٹوں مسکراتا رہا۔

اُس کی ان حرکات کو دیکھ کر مجھے اکثر اوقات شبہ ہوتا تھا۔ کہ وہ نیچر کی طرف سے مسرت کا پیام بن کر اس مادی دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ آہ! وہ اس دنیا کے قابل نہیں۔ اس کے خیالات بہت مقدس۔ بہت اعلیٰ وارفع ہیں۔ اور ہماری دنیا بہت کثیف وحقیر!

گرم موسم کی ایک تاریک رات میں مَیں اپنے دریچے میں بیٹھی آسمان کے تاروں کو تفریحاً گھور رہی تھی کہ ایک دیوانہ گاتا ہوا میرے سامنے سے گذر گیا۔ اور جنگل کی مہیب تاریکی میں غائب ہو گیا۔

خوفناک خاموشی میں ایک بے تکے قہقہے کی آواز جنگل کی تنہائیوں میں گونج رہی تھی!!

وہ اندھیرے میں لڑھکتا ہوا شہر کی ویران گلیوں سے ہوتا ہوا جنگل میں چلا گیا . . . آہ۔

بڑے بڑے درختوں کی جھکی ہوئی شاخوں نے اس کا چہرہ لہولہان کر دیا۔ اس کا گریبان تار تار ہو گیا۔ یہاں تک کہ وہ ایک ایسی ہیبت ناک غیر آباد جگہ پہنچ گیا۔ جہاں راستہ ختم ہو جاتا تھا۔ جہاں سرو کے کالے کالے گنجان درخت کھڑے تھے۔ اور جہاں قدیم کیکروں کے جھنڈ میں مدّت کے پرانے پانی کا ایک تالاب تھا۔

سرو کے پتّے ہلتے اور پرانا پانی سسکی سی لیتا۔ تو ایک ایسی مدھم مہیب آواز پھیل جاتی کہ سننے والوں کو دھوکا ہوتا کہ فرشتۂ موت کسی قریب ہی کے مخفی گوشہ میں بیٹھا کراہ رہا ہے۔

. . . اللہ غنی! کیسی ہولناک جگہ تھی۔

جب گنجان درختوں کے پتّے جنگل کی ہوا سے کانپنے لگتے تو ایک آدھا تارا پتوں میں سے ہو کر تالاب کے پانی میں بے چین نظر آتا۔ اور ایسا ہیبت ناک معلوم ہوتا جیسے اژدھے کا دیدہ چمک رہا ہے۔

وہ وہاں پہنچ گیا . . . وہاں پہنچ گیا۔ جہاں پرانے پانی پر مدتوں سے موت کا سایہ کانپ رہا تھا . . . ایسی جگہ جہاں شاید اُلّو بھی بولنا پسند نہ کرے اور جہاں چمگادڑیں بھی بسیرا نہ لیں۔ یہ جگہ

گاؤں کے قبرستان کے قریب تھی۔

وہ تالاب کے کنارے بیٹھ گیا۔ اس کے قریب سانپ رینگ رہے تھے۔ سوکھے پتوں میں جنگلی چھپکلی بیٹھی چیخ رہی تھی۔ جھینگا اپنی بین بجا رہے تھے۔

دیوانہ کنارے پر بیٹھا تھا۔

دفعتاً اس نے جھک کر تالاب کے تھمے ہوئے پانی میں اپنی شکل دیکھی۔ اس کی ڈاڑھی بہت بڑھ گئی تھی۔ اس نے مدتوں سے خط نہیں بنوایا تھا۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ تھیں۔ اس نے ایک زور کی چیخ ماری۔ اپنے عکس کو پانی میں مخاطب کر کے زور سے چلا اٹھا۔

"خداوندا! میں کون ہوں؟"

کائنات اس کا جواب سوچنے میں چپ چاپ تھی!!

پھر ایک پاگل اور آسیب زدہ قہقہے کی آواز نے جنگل کی تاریکی کو چیر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک دھماکا ہوا!!

سنتے ہیں۔ کئی دنوں کے بعد اک گلی سڑی لاش اس تالاب سے برآمد ہوئی!

خدا جانے اس کا کیا ارمان تھا! . . .

اور کیا رومان تھا!

دیوانوں کی زندگی واقعی ایک راز ہے!

آہ - دیوانے خود ایک معمّہ ہوتے ہیں - کوئی پہچان نہ سکا کہ

ان کی ذہنیت کیا ہوتی ہے!

مردہ دوست کی آواز

ہائے وہ وقت . . . ؟

کیا تمہیں یاد ہوگا . . . پر آہ . . . اب تمہیں کیا یاد ہوگا . . . وہ وقت جبکہ میری روح قفس عنصری سے باہر نکلنے کے لئے پھڑ پھڑا رہی تھی ۔ میرا سانس مشکل سے کبھی رُک رُک کر اور کبھی تیز تیز چل رہا تھا ۔

میری آنکھیں جو کوئی دم میں قبر کی تاریکی میں پنہاں ہونے والی تھیں ۔ تمہارے چہرے کی بلائیں لے رہی تھیں ۔ ہائے وہ وقت ! مگر اب تمہیں کیوں یاد ہوگا ! . . . مگر مجھے یاد ہے ۔ وہ ستم انگیز مگر روح کی آزادی کا دن وہ قیامت خیز مگر مصیبتوں

کے خاتمہ کا لمحہ - وہ مجھے آج بھی - آج اتنے سال کے بعد بھی یاد ہے . . . جیسے کل کی بات ہو . . . !

کمرہ تاریک پڑا تھا - شاید کوئی ہلکی سی روشنی دور پردے کے پیچھے ہوگی + کھڑکی میں سے ہو کر نظر آرہا تھا - کہ سورج کہیں دور تالاب کے اس پار حنا کی میانہ قد جھاڑیوں میں میری طرح دم توڑ رہا ہے + میرے گرد چیزوں کا ایک انبار لگا تھا - دوا کی بھری ہوئی اور خالی شیشیاں کچھ میوے کی طشتریاں - میرے بخار کا چارٹ سفید چادریں - لحاف ۔

میرے گرد لوگوں کا اژدھام تھا - گھر کے سب لوگ - ہمسائی اور خدمت گار میری چارپائی کے اطراف تھے - اور ان میں . . . تم بھی . . .

اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا - جیسے ان سب لوگوں سے زیادہ تم بے قرار ہو رہے ہو - کیونکہ تم رہ رہ کر میری چارپائی کے گرد گھوم رہے تھے - اور میری پیشانی اور ہونٹوں پر حسرت کی نظر ڈالتے تھے - جن پر بوسہ دینے کی تمنا میں موت کا فرشتہ میری چارپائی کے گرد منڈلا رہا تھا ۔

ہائے وہ شام . . . ! میرا تکلف سے سانس لینا - طویل

بیماری کی اذیت۔ ناتوانی کی مصیبت اور پھر دنیا۔ اس چھوٹی سی دل فریب دنیا سے۔ عزیزوں سے۔ اور پھر سب سے بڑھ کر اے جان سے پیارے تم سے بچھڑ جانے کا صدمہ۔ جدائی کا غم۔ ہائے وہ شام میری زندگی کی آخری شام!

دوست میرے دوست۔ مجھے تمہارا بے قراری سے رونا اور بار بار میرے کھلے ہوئے منہ میں پانی کے قطرے ٹپکانا اور کبھی طبیب سے یہ پوچھنا۔ کیا اب کسی تدبیر سے یہ نہیں بچے گی؟ اب بھی یاد آتا ہے۔ تو میری عجیب کیفیت ہو جاتی ہے۔

پھر کچھ دیر بعد میری تکلیف بڑھ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سینکڑوں آدمیوں نے مجھے زنجیروں سے باندھ رکھا ہو۔ میرا سانس بڑی مشکل سے چلتا تھا۔ اور میرا سارا بدن پسینہ سے شرابور ہو رہا تھا۔ پھر وہ وقت آیا۔ ہائے وہ المناک وقت۔ کہ میری روح جسم سے اور میں تم سے جدا ہونے لگی۔ ہائے وہ وقت بڑا بُرا ہوتا ہے۔ پس ماندگوں کے لئے بھی۔ مرنے والے کے لئے بھی!

ایک جھٹکے کے ساتھ میری گردن تکیے کے نیچے جا گری۔ تم میرے قریب آگئے۔ اور میری پیشانی کا روتے ہوئے سکیاں

لیتے ہوئے بوسہ لیا۔ اور کہا "ہائے"!

... پھر میں تم سب سے جدا ہو گئی *

پھر مجھے وہ وقت بھی یاد ہے۔ جب میرے مرتے ہی تم بے ہوش ہو کر گر پڑے تھے۔ لوگوں نے ماتم کیا تھا۔ دوستوں نے آہیں بھری تھیں۔ رشتہ داروں نے آنسو بہائے تھے۔ اس وقت میں تم سب کے درمیان کھڑی تھی ... میری بیماری کی بے چینیوں۔ سانس لینے کی مصیبتوں کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ اور تمہارا رونا پیٹنا بے معنی نظر آ رہا تھا * میں تم لوگوں کی آہ و زاری اور بے قراری دیکھ کر سخت بے چین تھی۔ اور تسلی دینے کے ذرائع سوچ رہی تھی۔ مگر میرے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا۔ کیونکہ اگرچہ میں تم سب میں کھڑی ہوئی تھی۔ اور حالات سے باخبر تھی۔ تاہم تم لوگوں سے بہت دور تھی۔ یوں کہو۔ اب ہمارے درمیان ایک خلیج حائل تھی۔ نہ میں تمہیں کوئی پیام بھیج سکتی تھی۔ نہ تم سے کوئی بات کہہ سکتی تھی۔ میں اس سرحد سے باہر ہو گئی تھی جہاں تم ہو *

یہ وقت بھی گذر گیا *

پھر مہینوں تم نے میرا ماتم کیا۔ ماتمی سیاہ لباس پہنتے رہے

تم نے کئی شام اور راتیں قبرستان کی ویران اور ہولناک چار دیواری میں میری قبر پر گزاریں۔ کئی دفعہ چیخ کر رو پڑے۔ پر آہ میری سخت اور بھورے رنگ کی قبر۔ وہ تمہیں تسلی نہ دے سکتی تھی۔ اگرچہ میں تمہاری بے قراری سے واقف تھی*

وہ وقت بھی گزر گیا*

پھر وہ وقت آ گیا۔ جب تمہارے رنج اور صدمے میں ایک سکون پیدا ہو گیا تھا + اب تم قبرستان میں روز کی بجائے آٹھ دن میں ایک دفعہ آنے لگے تھے۔ کبھی میرے لئے پھول لے آتے تھے کبھی نہیں بھی لاتے تھے + پھر تم نے زندگی کی دلچسپیوں میں آہستہ آہستہ حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ہاں اتنی بات ضرور تھی۔ کہ اتفاق سے کوئی میرا نام تمہارے آگے لے لیتا۔ تو تم ضرور رو پڑتے تھے*

پھر یہ وقت بھی گزر گیا*

پھر وہ زمانہ بھی آ گیا۔ جب تم اپنی زندگی کی دلچسپیوں اور مصروفیتوں میں ایسے منہمک رہنے لگے۔ جیسے کبھی کوئی حادثہ ہوا ہی نہ تھا + میری موت بھی ۔ ۔ ۔ آئے دن کی اموات کی فہرست میں ایک معمولی جگہ شامل کر دی گئی تھی + اب تو تم کبھی

بھول کر بھی میرا نام نہیں لیتے تھے۔ کئی دفعہ تم اپنے موٹر میں بیٹھے قبرستان پر سے گذر گئے۔ میں منتظر تھی۔ کہ شاید تمہیں بچھڑی ہوئی محبت کی کشش قبرستان کی طرف کھینچ لائے گی . . . مگر آہ . . . تم قہقہے لگاتے ہوئے اس پرانی قبر پر سے گذر گئے۔ جس کے اندر تمہارا ایک پرانا محبت کرنے والا دوست بند پڑا ہے!

قبر پر کوئی خبر لینے نہ آیا بعد مرگ۔
زندگی تک تو بہت تھے چاہنے والے مرے

ہر آدمی کا یہی حشر ہوتا ہے۔ دنیا کی محبت کی فلاسفی بس اتنی ہی ہے۔ کوئی کسی کے لئے جان سے نہیں جاتا۔
محبت کے معنے یہی ہیں۔ کہ محض زندگی کی رونق کے لئے چند دن محبت کر لی۔ جب یہ پیالہ لبریز ہو جاتا ہے۔ تو محبت کا آتشکدہ بھی ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔
آج تم مر گئے۔ کل تمہاری محبت کے دعویدار تمہیں ایسے بھلا بیٹھیں گے۔ جیسے تمہاری موت ان کے لئے کوئی حادثہ ہی نہ تھی ہمیشہ سے یہی ہوتا آیا ہے۔ اور شاید یہی ہوتا رہے۔ آہ محبت ناآشنا بے وفا انسان!

کوّا

چمکیلے گرم ایشیائی ممالک کا یہ زندہ دل شریر۔ سیاہ فام پرندہ دوسرے پرندوں سے بالکل مختلف حیثیت رکھتا ہے۔ بڑا بدمذاق ہے!

اسے مشرق کے سرخ گلاب سے کوئی تعلق نہیں!

اسے سفید شبو کی خوشبوؤں سے کوئی واسطہ نہیں!

شمشاد کا میانہ قد درخت جب مغرب سے اٹھنے والی غضبناک آندھی سے مارے غصے کے کانپنے لگتا ہے۔ اور ننھے ننھے پرندے اپنے آشیانوں میں منہ چھپائے بیٹھ جاتے ہیں۔ تو یہ شریر ننھا سا سیاہ پرندہ ہواؤں میں کائیں کائیں کرتا۔ اڑتا نظر آتا ہے۔ جیسے

تند ہواؤں میں کوئی سیاہ پتنگ اُڑ رہا ہو۔

اس میں شعریت نام کو نہیں۔

حتٰی کہ اسے مشرقی گرم ممالک کے عاشق مزاج۔ خوش گو بلبل سے بھی مطلق دلچسپی نہیں۔ دلچسپی کا کیا ذکر۔ یقین کیجئے۔ وہ کیٹس کی اس خوش گو محبوبہ کا جانی دشمن ہے۔ جہاں اس نے اسے دیکھا۔ بس اس کا کچومر نکال دیتا ہے۔

. . . شاید وہ مشہور کہانی آپ نے نہیں سُنی! اُف ایسا کا زمانہ تھا۔ صنوبر کے ایک پیڑ میں بلبل کے تین بچے تھے۔ جن کی آنکھیں گول اور چمکیلی تھیں۔ یہ ظالم وہاں جا پہنچا۔ اور انہیں صاف کھا گیا۔ وہ دن اور آج کا دن . . . اب بلبل نے پھر کبھی صنوبر کے اس پیڑ میں بچے نہیں دیئے۔

یہ بڑا متعصب ہے۔

اسے سوائے اپنی قوم کے دنیا میں کسی قوم سے نہ محبت ہے نہ ہمدردی۔ کوؤں نے بالکل اپنی ایک علیحدہ دنیا بنا رکھی ہے!

بڑا ظلمی ہے!

چیل کا وہ مخالف۔ سبز ک کا وہ دشمن۔ ننھی چڑیا سے اسے نفرت چغد سے اسے چڑ۔ طوطوں کا یہ رقیب۔ کوئل کا یہ حریف۔ بس ع

"میں ہوں۔مری دنیا ہو اور گوشہ تنہائی"+
کے اصول پر زندگی بسر کر رہا ہے!
یہ بڑا بے تکلف واقع ہوا ہے۔اجنبیت اس میں نام کو
نہیں!
اکثر دیکھنے میں آیا ہے۔کہ دوپہر کے وقت کسان کھیت میں
بیٹھے اناج چن رہے ہیں۔اور آپ ان سب کے درمیان پہلو بہ
پہلو بیٹھے کائیں کائیں کر رہے ہیں۔
بڑا ہی ندیدہ ہے۔
اسے باورچی خانے سے عشق ہے+یہ تو اس کی زندگی کا
نصب العین ہے۔کہ کہیں سے سکہ لے اڑا۔کہیں باورچی کی نظر
بچا کر انڈا اڑا لے گیا۔کبھی گوشت۔کبھی روٹی۔کبھی اطمینان سے
بیٹھا گھی پی رہا ہے۔اتنے میں کسی نے ڈانٹ بتائی۔اور آپ
بقدر ضرورت وہاں سے چند قدم پرے ہٹ گئے۔
خیر یہ سب تو اس کے کام کی چیزیں ہیں۔اس کی بھوک
کا خیال کر کے ہم نے یہاں تک بھی صبر کر لیا۔مگر اس کے دخل
در معقولات کی عادت کو ہم کس طرح معاف کریں+وہ انسان کی
گھریلو زندگی کے ہر شعبہ میں دخیل ہوتا ہے۔تو یوں کہئے . . .

کوّا کیا ہے۔خدائی فوجدار ہے۔

انصاف کیجئے۔ اسے غسل خانوں سے کیا تعلق؟ مگر یہ گستاخ وہاں بھی گھس جاتا ہے۔ وہاں سے صابن لے اڑتا ہے۔ اب غور کیجئے صابن اس کے کس کام کا؟ کیا اپنا سیاہ چہرہ صابن سے دھو کر گورا کرے گا؟ اس کی بھی تو امید نہیں۔ کبھی منجن کی ڈبیہ کھول کر منجن چکھتا ہے۔ کبھی آئینے پر چونچیں مارتا ہے۔ غضب ہے کہ کتب خانے میں بھی بے تکلف جا پہنچتا ہے۔ میز پر سے دوستوں کے محبت نامے کھول کر پڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی کاغذوں کے پرزے پرزے کر ڈالتا ہے۔ تو یہ ایسا پرند کس کام کا۔

کبھی دھاگا لے اڑتا ہے۔ کبھی قینچی صحن میں ہے۔ اب دستکاری کی ماہر اور شوقین بہنیں چاہے اسے کوسے جائیں۔ اپنی چیزوں کو ڈھونڈیں۔ اس سے کوّے کو کیا تعلق۔ وہ اپنا کام کر چکا۔

بڑا شکر ہے۔ کہ خدا نے اسے انسانی زبان نہیں دی۔ جو کہیں قدرت نے اسے زبان بخش دی ہوتی۔ تو یہ ظالم گھریلو معاملات پر رائے زنی کئے بغیر بھی باز نہ آتا۔ ساس اور بہو کے

جھگڑوں میں قاضی بنتا۔ شادی بیاہ کے قصوں میں دخل دیتا اور خدا ہی علیم ہے۔ کہ اس دخل اندازی کا انجام کیا ہوتا +
خدا نے ایک مصیبت سے انسان کو بچا لیا +

مئی کے آتشی مہینے میں دوپہر کا آرام پہ سنگ دل حرام کر دیتا ہے + لو کی لپٹیں چل رہی ہوتی ہیں۔ ایشیا کا گرم آفتاب کھلے ہوئے آسمان پر پیتل کی تھالی کی طرح چمک رہا ہوتا ہے تمازت آفتاب سے ڈر کر پرندے خدا جانے کدھر غائب ہو جاتے ہیں پس ایسے وقت یہ برآمدے میں یا خواب گاہ کے دروازے پر بیٹھا چیخے جا رہا ہے۔ چیخے جا رہا ہے۔ کائیں کائیں ہزار اسے ماریئے وہاں سے بھگایئے۔ اڑانے کی کوشش کیجئے۔ کیا مجال جو وہاں سے چلا جائے۔ اڑتا ہے۔ اور پل بھر میں پھر وہیں کا وہیں +

موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ طوفان آ رہا ہے۔ سمندر شیر کی طرح گرج رہا ہے۔ ایسے وقت میں یہ بے فکر نہایت اطمینان سے دیواروں پر یا انگنائی میں بیٹھا نظر آتا ہے +

ان سب خرابیوں کے باوجود نہیں معلوم کیوں۔ مجھے کوے سے بڑی دلچسپی اور بڑی محبت ہے + گرمیوں کی ویران دوپہر

میں اس کی سنسان چیخ بعض اوقات مجھے تو بہار کی شام میں
گانے والے بلبل کی سریلی نغمہ سنجیوں سے زیادہ متاثر کر دیتی ہے
خدا جانے کیوں؟

عذرا

(ایشیائی جون کی اک صبح کے حالات)

تمہارا محبت نامہ مجھے "بندرگاہ سلطانیہ" ہی پر مل گیا تھا پر مجھے جواب لکھنے کی مطلق فرصت نہ تھی۔ کیونکہ میں آج کل "اودے پہاڑوں" کی ناہموار چوٹیوں پر ایشیائی جون کے جگمگانے والے گہرے نیلے آسمانوں کی پرستش میں مصروف ہوں۔ اور دن دن بھر اس محبوب مشغلہ میں مصروف رہتی ہوں۔ یا پھر فرصت کے لمحوں میں افسانے سوچا کرتی ہوں یا ستار بجاتی ہوں ٭

مگر آج صبح ہی مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ ضرور تمہارے محبت نامے کا جواب لکھوں گی۔ کیونکہ جی بہت خوش ہے۔ اور

گلابی ہونٹوں پر صبح سے ایک بے ساختہ مسکراہٹ کھیل رہی ہے ٭
بات یہ ہے کہ آج صبح جونہی میں بیدار ہوئی۔ سامنے ایک لمبی سی عربی وضع کی اور فیروزی رنگ کی دریچی کھلی ہوئی نظر آئی۔ اور مری نظر اس میں سے ہو کر آسمان پر پڑی۔ جس پر ماہ جون کے سنہرے اور گلابی بادل رقصاں تھے۔ اور چنار کے درختوں پر نیل گوں چشم سبز رنگ بیٹھی سیٹی بجا رہی تھی۔ پس یہ دیکھ کر روح مسکرا پڑی۔ اور دل بے تاب ہو گیا۔ کہ تمہیں خط لکھوں ٭
جون ... چمکدار حسین اور سجیلا جون شروع ہو گیا! کلیاں شرما کر زمین کو تک رہی ہیں۔ اور پھول مسکرا کر آسمان کو گھور رہے ہیں۔ اور نیچر مصروف آرائش ہے! ابلتے ہوئے چشموں کی موسیقی۔ جون کے آفتاب کی زرد روشنی میں گونج رہی ہے بلاشبہ ... جون اپنے حسن اور جگمگاہٹ کے لحاظ سے بارہ مہینوں میں افضل مہینہ ہے۔ وہ بھی ایشیائی چمکیلا جون!
آج طبیعت نہایت بشاش ہے۔ وجہ یہ کہ گذشتہ شب میں نے چارلی چپلن کا ایک دلچسپ اور مذاقیہ فلم دیکھا تھا۔ اور واپس آکر جونہی بستر پر لیٹی۔ میرے تخیل کے پردوں پر انواع اقسام کے حسین حسین خواب جلوہ گر ہونے لگے۔ او مالک! میں

نے خواب میں اپنی کئی دل پسند صورتیں دیکھیں لیکن پیاری جوتی! یقین کرو۔ ان سب میں سب سے زیادہ دل پسند اور محبوب تمہاری اور ہاری کی صورتیں ہیں + اپنے ڈاکٹر صاحب کی صورت سے تو مجھے قطعی گھن ہے۔ اس لئے وہ نامبارک چہرہ نظر نہیں آیا او معبودا! خواب کیا تھے اچھے خاصے فردوسی مناظر تھے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ میں جنت میں بھی سنیما دیکھ رہی ہوں + کبھی دیکھا کہ ہم زمانۂ گذشتہ کی طرح "کوہ فیروز" کے باغوں میں پھولوں سے مصروف کلام ہیں۔ کبھی دیکھا کہ وہاں کی شفاف نہروں میں سرخ رنگ کی اور گول دیدوں والی چمک دار مچھلیاں پکڑ رہے ہیں۔ ہائے! دل میں اک ہوک سی اُٹھی۔ زمانۂ رفتہ کی یاد تازہ ہو گئی۔ اور میں نے ایک بے چین ادا سے مسکرا کر نیند کا طلسم توڑ دیا۔ اور بستر پر اُٹھ بیٹھی +

جب نیند ایسے دل پسند خوابوں سے معمور ہوتی ہے۔ تو دوسرے دن آنکھ کھلنے پر دل بڑا خوش خوش رہتا ہے۔ گلابی ہونٹوں پر مسکراہٹ اور سیاہ آنکھوں میں مسرت کی جگمگاہٹ صاف عیاں ہوتی ہے۔ ایسے ہی موقعوں پر دور افتادہ اور پیارے پیارے دوست یاد آتے ہیں۔ اور دل پر ایک ٹھیس

سی لگتی - اور بے اختیار ہونٹ سے اک آہ نکلتی ہے۔ اُف ستم انگیز جدائی . . . جان لیوا جدائی . . . ! آج صبح سے مجھے تم اور ہارلی بےطرح یاد آ رہے ہو۔ دل یہی چاہتا ہے - کہ کاش میں وطن میں ہوتی! آہ جسوتی! پیاری جسوتی! ہم سیاحوں کی قسمت!

"کھوتی ہے جان بلبل نالاں چمن سے دور
دشمن کو بھی کرے نہ مقدر وطن سے دور!"

خیر اب ان الم انگیز باتوں کو جانے دو۔ مرا ننھا سا دل تڑپ اٹھے گا۔ اور تم جانتی ہو کہ جب میں مچل جاتی ہوں۔ تو پھر مشکل ہی سے سنبھلتی ہوں۔ اس لئے ان الم انگیز باتوں کو جانے دو۔

آج صبح سے ناریل کے اونچے اونچے درخت جنوب کی ہواؤں میں گیت گا رہے ہیں۔ اُف صبح کا وقت بھی معبود نے عجب بنایا ہے! اس پر مستزاد اوائل جون کی روحانی سرور انگیز صبحیں! خصوصًا سمندر کے کنارے اور پہاڑوں کی عظیم الشان چوٹیوں پر!! بشرطیکہ ہمارے خواب خوش ہوں۔

آج صبح زوناش نے میرے لئے تیتری کے رنگ کا اک

لباس الماری سے نکالا۔ جس پر تیتری کی وضع کی زرد اور نیلی دھاریاں ہیں کہیں کہیں گہری نارنجی اور گلابی رنگ کی لکیریں بھی ہیں۔ تم جانو مجھے زرد اور گلابی رنگ سے ذرا بھی شوق نہیں۔ میں تو سمندروں اور آسمانوں کے نیلے رنگ کی شیدائی ہوں۔ لہٰذا میں نے وہ پوشاک اس بوڑھی حبشن زرونا ش ا کے منہ پر دے ماری۔ پھر اس نے الماری سے اک ایسی پوشاک نکالی جس کا رنگ ندی کے کنارے اُگی ہوئی سبزی مائل زرد گھاس سے مشابہ تھا۔ میں نے دو لمحے اعتراض آمیز نظروں سے اُسے دیکھا۔ پھر بولی:۔

"اری بد دماغ چھپکلی! اجون کی اس ایشیائی چمک دار صبح میں۔ آفتاب کی دل فریب شعاعوں میں چہل قدمی کرنے کے لئے یہ تو نے کس رنگ کا لباس نکالا؟ یہ موزوں نہیں"۔

مُسکراتے ہوئے یہ کہہ کر میں الماری کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ اور ایک ایسا لباس نکالا جس کا رنگ کچھ سمندر کی نیلاہٹ کچھ آسمان کی سبزی لئے ہوئے تھا۔ ہاں طاؤس اور سبز رنگ کے پروں کے رنگ کی بھی اس میں آمیزش تھی۔ اور جگنو کے پروں کی جگمگاہٹ بھی اس میں مضمر تھی۔ اور کچھ کچھ کاسنی

رنگ اس طرح جھلک رہا تھا۔ جیسے اپریل کی پر زور برسات کے
بعد شام کے وقت آسمان کی قوس و قزح ہوتی ہے۔ بلاشبہ یہ
لباس جون کی اس خوش گوار صبح کے لئے نہایت موزوں تھا۔

چونکہ زوناش بہری ہے۔ اس نے میرا اعتراض آمیز جملہ
نہیں سنا۔ وہ ایک غربی وضع کے ننھے سے دروازے میں
کھڑی ایک پرانی عشقیہ غزل گا رہی تھی۔ آج صبح اس کی آواز
غیر معمولی طور پر سیٹی کی طرح باریک تھی۔ مری آواز کا کیا کہنا!
جون کی خوش گوار صبح میں میری آواز سیٹی سے زیادہ باریک اور
بانسری سے زیادہ سریلی ہو گئی تھی۔ یوں کہئے اس میں بلبل کی
سیٹی کی سی لچک تھی۔ تو مینا کے لہجے کی سی چہک! قمری کے
نغمے کا سا سوز تھا۔ تو کوئل کی کوکو کا درد! میں بات کرتی تھی تو
ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے بہار کی ہوائیں پھولوں کی پنکھڑیوں
سے ٹکرا رہی ہیں۔

آج مرا ارادہ بہت لمبی چہل قدمی کا ہو رہا تھا۔ میں لباس
پہن کر باہر جانے کے لئے دروازے کی طرف جا رہی تھی
کہ اچانک مری نگاہ سامنے قد آدم آئینے پر پڑی اور میں ٹھٹک
کر کھڑی ہو گئی۔ بے ساختہ مسکرانے لگی۔ کیونکہ اس صبح میرے

صندلی کاہیدہ جسم میں ایک شوخ لچک محسوس ہو رہی تھی۔ چہرہ موسمی فانوس کے شعلے کی طرح دمک رہا تھا۔ اور ہونٹ۔ عشق پیچاں کے آگ کے رنگ کے پھولوں کی طرح گلابی ہو گئے تھے اے اللہ۔ آج یہ مجھ پر کس دیوتا کا عکس پڑ رہا ہے!

میں ایک خوب صورت دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ اور ایک کھیت میں اتر گئی۔ اک پگڈنڈی پر چلنے لگی۔ اپنے آپ کو اتنی محبوب محسوس ہو رہی تھی کہ بیان سے باہر ہے۔ بار بار مسکراتی جاتی تھی۔ اک آدھ دفعہ زور کی ہنسی بھی آ گئی۔

مرے اطراف شہتوت اور دیودار کے درخت چپ چاپ کھڑے مجھے تک رہے تھے۔ بالکل ایسے لگتے تھے۔ جیسے کسی جادوگر کے غلام سحر کے زور سے ساکت کر دئے گئے ہوں۔ ان کے سبز پتوں کے بیچ میں۔ جون کے دل فریب آفتاب کی سنہری شعاعیں جگمگا رہی ہیں۔ رنگین چڑیاں اور خوش گلو پرند دل فریب موسم کی ہواؤں میں تیر رہے تھے اور گا رہے تھے کہیں کہیں دور پہاڑوں کے دامن میں مویشی نظر آ رہے تھے ان کے ساتھ دہقان۔ جو شہری تہذیب و تمدن سے بے نیاز سبز آسمانوں کے نیچے فطری آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرتے

ہیں۔

اتنے میں یکایک کہیں دور کی دنیاؤں سے بادل آ گئے۔

جسوتی! تم نے کبھی پہاڑ کے سنہرے بادلوں کو برستے دیکھا ہے؟

اے اللہ! جب پہاڑ کے بادل۔ سنہرے اور کاسنی اور نارنجی بادل زمین پر برستے ہیں۔ تو آدمی بالکل نہیں بھیگتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پریوں کے آنسو ٹپک رہے ہوں۔ برسات کی آواز میں ایسا دل گداز ترنم ہوتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے رات کے وقت خواب کے جزیرے میں کوئی ہلکی ہلکی محبت میں ڈوبی ہوئی باتیں کر رہا ہو۔

تھوڑی دیر بعد جب بارش ختم گئی۔ تو پہاڑ کی ایک نیلی چوٹی پر پھر جون کا گستاخ آفتاب جگمگانے لگا۔ زمین۔ آسمان پہاڑ۔ سمندر یکایک نور میں ڈوب کر رہ گئے۔ زمین پر تناور درختوں کے سائے کسی مجرم کی طرح لرز رہے تھے۔ کانپ رہے تھے۔ دور پر ایک نہر بہہ رہی تھی۔ جس میں کشتیاں تیر رہی تھیں ایک کشتی پر نیلا سا بادبان چڑھائے اک نوجوان ملاح بیٹھا درد محبت میں ڈوبا ہوا ایک شعر گا رہا تھا۔ آہ! یہ بدنصیب ضرور خراب محبت ہے۔ جبھی تو کمبخت کی آواز میں اتنا سوز ہے۔ یہ

سوچ کر میرا دل بھی اداس ہو گیا۔

ــــ زندگی مجھے ایک دلچسپ کتاب معلوم ہوتی تھی۔ اور دل چاہتا تھا کہ ہزار ہا سال کائنات کی ان دل فریبیوں کو تکا کروں یہ بھوری زمین۔ یہ سبز آسمان۔ یہ نیلا سمندر۔ اور یہ سیاہ عظیم پہاڑ!! ... جن پر ایک نامعلوم حکمراں طاقت نے حسن کا ملمع چڑھا دیا ہے۔ یہ چیزیں اس قابل ہیں۔ کہ ہم ان کی پرستش کریں۔ ان کی پرستش دراصل معبود کی پرستش ہے۔

جون کے سبز آسمانوں پر ابابیلیں جھومر ڈال رہی تھیں کہیں چیل اڑ رہی تھی۔ کہیں کوا چیخ رہا تھا۔ کبھی دور کے جنگلوں سے کھٹ بڑھئی کی دل خراش آواز چلی آ رہی تھی۔ مجھے نیلے آسمانوں سے اب تک ویسا ہی عشق ہے۔ جیسا تمہاری موجودگی میں تھا۔ چنانچہ میں چلتے چلتے شمشاد کے ایک میانہ قد درخت کے نیچے کھڑی ہو گئی۔ اور محبوب آسمان کی نیلاہٹ کو تکنے لگی۔ اس وقت مجھے بچپن کے خوب صورت خواب یاد آ رہے تھے۔

دفعتاً میں نے زمین کی طرف دیکھا۔ آہ!! کتنا وقت گذر چکا تھا۔ سورج بہت تیزی سے اوپر کو بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ اور

مجھے بار بار زندگی کا اختصار یاد دلا دیتا تھا۔ آہ کتنا وقت گذر چکا تھا۔ اور میں . . . میں بے خبر تھی ۔ اوائل جون کی ہواؤں میں تمازت محسوس ہو چلی تھی ۔ دنیا کاروبار میں مصروف ہو گئی تھی ۔ دہقان مویشی کو لئے پہاڑ کے دامن میں پہنچ گئے تھے دھوبی گھاٹ پر مصروف تھے ۔ اور میں . . . آہ میں ۔ اک کاہل حسن پرست کی طرح ابھی تک صرف آسمان کو تکنے میں مشغول تھی . . . ! یہ سوچ کر دل اداس ہو گیا ۔ آہ زندگی . . . !!

میں چند بھولے بسرے مصرعے گنگناتی ہوئی آہستہ آہستہ گھر کی طرف چلی ۔ دل میں اب وہ امنگ باقی نہیں رہی تھی ۔ نہ روح میں شوخی تھی ۔ اک شاعرانہ اضمحلال ۔ اک افسانوی افسردگی محسوس ہو رہی تھی ۔ اُف کتنا وقت گذر چکا تھا ۔ اور میں بے خبر تھی ۔۔

میرا خیال نہ جانے کس اُجڑے جزیرے میں گھوم رہا تھا ٹھنڈی آہیں چلی آ رہی تھیں ۔ دل دھڑک رہا تھا ۔ زندگی کے احساسات میں وہ بے فکری نہیں رہی تھی ۔ اداسی چھا گئی تھی ۔ ہائے یہ مجھ پر کیا افتاد پڑی ؟ بلند آسمان !! . . .

میں نے اپنے گھر کے دروازے میں قدم رکھا۔ برآمدے میں میرا یونانی طوطا چیخیں مار رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے زندگی کا نوحہ پڑھ رہا ہے۔

میں ایک پاکیزہ روح کی طرح دبی دبائی دبلے پاؤں نیچے گئی۔ زوناش کو جھانک کر دیکھا۔ وہ باورچی خانے کی دیوار پہ کوئلے سے کچھ یادداشت لکھ رہی تھی۔ غالباً عمر خیام کے اشعار ہوں گے۔

میری صبح کی تفریح کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ روح پر اداسی مسلط تھی تو دل پر ویرانی۔ میں نے خط کا کاغذ اٹھا لیا۔ اور ایک گول دریچے میں چپ چاپ بیٹھ کر تمہیں خط لکھنے لگی۔

دوپہر ہو چلی تھی۔ سنسان سڑکوں پر دہقان گیت گاتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ گلیاں ویران پڑی تھیں۔ اور میں زندگی کا مسئلہ سوچ رہی تھی!

خدا حافظ

بیمار غم

ابھی تو زردی ہے رُخ پہ کم کم۔ ابھی سے روٹھے ہیں سارے ہمدم
یونہی جو چندے رہی تپِ غم۔ تو پھر لہو بھی نہیں رہے گا

اسے لا کر اس کی خواب گاہ میں لٹا دیا گیا۔

رات گرم تھی اور ویران۔

اس کی خواب گاہ کی دیواریں ہلکے آسمانی رنگ کی تھیں ان پر سیاہ رنگ میں چینی کسانوں کی تصویریں پینٹ کی ہوئی تھیں۔ جو چائے کے کھیت میں مشقت کر رہے تھے۔ خواب گاہ کے لمبے لمبے۔ سنہرے اور فیروزی رنگ کے پردے خزاں

کی ہوا سے نہ جانے کیوں ایک عجیب الم ناک انداز میں ہل رہے تھے۔ جیسے کوئی انہیں جھنجوڑ رہا ہو۔ اور زندگی کے خواب سے بیدار کر رہا ہو۔

ایک طرف ایک چھوٹی سی منقش صندل کی میز پر چاندی کے دو بڑے بڑے گلدانوں میں حنا کے پھول رکھے تھے۔ جن کی نکہت کمرے کو کچھ زیادہ حسین بنا رہی تھی۔

اک کونے میں آسمانی رنگ کے پتھر میں محبت کے دیوتا کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ اس کے قدموں میں میری پالتو بلی نکورتی سو رہی تھی + دریچے کے نیچے ستار بیکسی کی حالت میں پڑا تھا اس کا غلاف کوچ کے پاس ہی قالین پر رکھا ہوا تھا۔ اس سے کچھ دور بہار خزاں کے چند خشک اور زرد پتے پڑے ہوئے تھے۔

اسے لاکر خواب گاہ میں لٹا دیا گیا۔ نیلی ساٹن کے فانوس سے چھن کر مدھم چراغ کی پیلی پیلی کرنیں اس کے لیمو جیسے زرد رنگ چہرے پر کانپ کر اس کی ناتوانی اور اضمحلال کو زیادہ دردناک بنا رہی تھیں + سیاہ۔ دراز اور ایشیائی حسن و دل فریبی سے لبریز ساٹن جیسے بال مخملی تکئے پر بکھر گئے تھے۔

آہ ناشاد لڑکی! ۔ ۔ ۔ !

زندگی نے اس سے برا سلوک کیا۔

میں انتہائی فکر مندی اور اضطرار کی کیفیت میں اس کے سرہانے ایک چھوٹی سی الماری سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ اور اسے دیکھ رہی تھی۔ ہائے وہ وقت! مجھے اب تک نہیں بھولا۔ واقعی زندگی کے چند واقعات انسان کو کبھی نہیں بھولتے!

رات سنسان اور خاموش تھی۔ قبرستان کی شام کی طرح خاموش! . . . کھڑکی کے باہر باغ میں کہیں دور ناڑ کے چپ چاپ درختوں پر چاند طلوع ہو رہا تھا۔ خزاں کی ہوائیں خشک پتوں کو اُڑا اڑا کر اندر لا رہی تھیں۔ کئی تو اس کے بستر پر بھی پڑے تھے۔ قریب ہی دریچے کے باہر ناشپاتی کی اک خزاں رسیدہ پتلی سی ٹہنی پر نیلگوں چشم عربی بلبل اداس بیٹھی زرد چاند کو تک رہی تھی جو اس کے پیچھے طلوع ہو رہا تھا۔ رات کے سناٹے میں اور چاند کی مدھم زرد روشنی میں۔ ننھی بلبل کی سیاہ تصویر ایسی نظر آتی تھی۔ جیسے کوئی مغموم روح عالم ارواح میں بیٹھی اپنے اعمال نامے پر غور کر رہی ہو۔

مرا اضطرار اور غصہ بڑھتا گیا۔ آہ! بدنصیب مظلوم لڑکی! ظالم رواج نے اسے تباہ کر دیا۔ اس کی زندگی کی پنکھڑی کو رواج

کی ظالم اور بے پناہ انگلیوں نے قریب قریب نوچ لیا . . .

اللہ! کیا مشرق میں لڑکی محض اسی لئے پیدا ہوتی ہے - کہ وہ دوسروں کی خوشیوں پر بھینٹ چڑھا دی جائے؟ کیا اسے خود اپنی زندگی کے معاملے میں بھی دخل دینے کا اختیار نہیں؟ کدھر ہیں وہ ریفارمر جو قوم کے آگے لمبی لمبی تقریریں کرتے اور بہبودیٔ قوم کا ترانہ بڑے زور شور سے گاتے ہیں؟ سٹیجوں پر کھڑے ہو کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر - قومی درد جتانے والے ریفارمر کدھر ہیں؟ وہ اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھیں - انہوں نے اپنی ماؤں کے لئے کیا کیا؟ . . . لڑکیوں کے لئے کیا کیا - جو کل قوم کی مائیں بننے والی ہیں؟ کیا ان کا ہمدردی اور قوم کے عشق سے لبریز دل . . . مظلوم لڑکیوں کی آہ سے تھرّا نہیں اٹھتا؟ کیا ان کی تمام ہمدردی - تمام درد محض فرقۂ رجال ہی تک محدود ہے؟ اگر ان کے احساسات صرف مردوں کے دکھ درد تک ہی محدود ہیں - تو پھر یہ بزرگ کس منہ سے قوم کے امام بنے پھرتے ہیں؟ پھر وہ کیوں اس نام سے منسوب کئے جاتے ہیں؟ کیا وہ عورت کو قوم سے خارج سمجھتے ہیں؟ کیا قوم صرف مردوں ہی کے اجتماع کا نام ہے؟

اے خدا! ان بزرگوں نے ہمارے لئے کیا کیا؟ کچھ نہیں کیا۔ آہ۔ کچھ بھی نہیں کیا۔ ان سے اتنا بھی نہ ہو سکا۔ کہ ہم کو زندگی کے اس نازک ترین مسئلہ میں رائے دینے کا اختیار دے دیں جس پر ہر مرد اور عورت کی آیندہ خوشیوں اور امیدوں کا انحصار ہوتا ہے۔ اور جس میں دخل دینا انسانی فطرت ہے + یہ لوگ لڑکوں کی یونیورسٹیوں کے لئے جھگڑتے ہیں۔ اپنی انجمنوں کے لئے بھیک مانگتے ہیں + اپنی شہرت کے لئے تقریریں کرتے ہیں + مگر ہمارے لئے آج تک کسی بزرگ نے کسی ریفارمر نے یہ قانون نہیں بنایا۔ کہ خود زندگی کے مسائل میں ہماری رائے ضروری سمجھی جائے . . .

کچھ سوچ کر میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں بیمار پر جھک گئی۔ اور بہ مشکل اتنا کہہ سکی۔ "جسوتی"!

اس نے آنکھ کھولی۔ سیاہ اور نرگسی آنکھ۔ جس میں روتے روتے گلابی ڈورے پڑ گئے تھے + میری طرف دیکھا۔ کمزور اداس حسرت مند نگاہ۔ جس میں ہزاروں ہی حسرتیں تھیں۔ اور کہا۔ "آہ!" . . . پھر چھت کی طرف تکنے لگی۔ اس کی نیم وا آنکھوں میں سے زندگی کی پرانی تمنائیں جھانکتی معلوم ہوتی تھیں۔ اب

بھی وقت تھا۔ اب بھی اس کے بزرگ اس پھول کو باد خزاں کے تند جھونکوں سے بچا سکتے تھے۔

میں آنسو پونچھتی ہوئی باغ کے دروازے سے باہر نکل آئی۔ اب چاند اداس چاند تاڑ کے چپ چاپ درختوں پر آ گیا تھا۔ اور خزاں رسیدہ ٹہنی پر مغموم بلبل اسی طرح خاموش بیٹھی آسمان تک رہی تھی۔

بُلبُل

آواز ہائے یہ کسی درد آشنا کی ہے

آہ پھر وہی پرندہ . . . !

دو سال ہوئے گرمی کی ایک صبح تھی۔ کسان بیلوں کو لئے کھیتوں میں آگئے تھے۔ کبھی کبھی کسی اُبلتے ہوئے چشمے کے کنارے سے کوئل کی دل گداز کُوکُو سنائی دے جاتی تھی۔

مَیں اُس وقت اپنی خوابگاہ میں لیٹی تھی۔ کوچ پر لیٹی تھی۔ اور صبح کی روشنی میری سرخی مائل سیاہ زلفوں کو چمکا رہی تھی دفعتًا کمرے کے باہر شمشاد کے ایک چھوٹے سے درخت پر ایک سریلی سیٹی بجنے لگی۔

کیا آپ کو بلبل کے فسانوں سے کسی طرح کی دلچسپی ہے؟
آپ نے کچھ نہیں نوجوان کیٹس کی بلبل کے ترانوں کے متعلق تذکرہ
پڑھا ہوگا؟ یہ صرف اس لئے پوچھتی ہوں کہ اگر آپ کو اس قصۂ
پارینہ سے کسی قسم کی دل بستگی نہ ہو۔ تو ساز کے اس تار کو میں
چھیڑوں ہی نہیں ÷

اچھا . . . میں تو وہ سرگذشت بیان کر رہی کہاں اب
سوال و جواب کرنے لگی ! . . .

اُس دن مجھے بہت سے کام انجام دینے تھے۔ اس لئے
میرا پروگرام یہ تھا۔ کہ صبح ہی سے اپنے مشاغل میں مصروف
ہوجاؤں۔ تاکہ غروب آفتاب کے ساتھ ہی میرے کام بھی ختم
ہوجائیں ÷

ان تمام مشاغل میں سب سے زیادہ ضروری کام ایک
افسانے کی تکمیل تھی۔ جس کو میں نے تین رات قبل لکھنا شروع
کیا تھا۔ اور آج دن کے ابتدائی گھنٹوں میں اسے مکمل کر دینا
چاہتی تھی ÷

میری بوڑھی خادمہ آہستہ آہستہ اپنے کام کر رہی تھی۔ اب
وہ بہت بوڑھی ہوگئی تھی۔ بولتی بھی کم تھی۔ سنتی بھی کم۔ مجھے

عموماً ایسے ہی لوگ زیادہ پسند ہیں ۔ اس نے صبح ہی لکھنے کی میز باغ کی دھوپ گھڑی کے قریب شاہ بلوط کے فسانہ پرور سائے میں لگا دی تھی۔ کاغذات رکھ دیئے تھے ۔ سب کچھ ہو گیا۔ تو "عمر خیام" کا ایک نامکمل شعر گنگناتی ہوئی میرے قریب سے نکل گئی ۔

میں صبح سے اپنا فسانہ سوچ رہی تھی۔ اور فسانے کے افراد سینما کے فلم کی طرح میرے خیال کے پردوں پر متحرک تھے یہی وقت قصہ کو صفحۂ قرطاس پر آتا دینے کے لئے موزوں ہوتا ہے ۔ وہ صبح بھی فسانہ نویسی کے لئے بہت موزوں تھی۔ کیونکہ گرمیوں کے دنوں میں دریچہ کے پاس ایک آسمانی روشنی ناچا کرتی ہے۔ ایسے مناظر قصہ نویسوں کے لئے فسانہ لکھنے کی بنیاد بن جاتے ہیں ۔

میں کوچ سے اٹھی۔ موسم کا لحاظ کر کے سمندری رنگ کا ایک گہرا نیلا لباس پہنا ۔ باغ کا دروازہ کھولا ہی تھا۔ کہ دفعتاً کھڑکی کے پاس ایک درخت پر باریک آواز میں ایک تیز سیٹی بجنے لگی ۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ تو نرگس کے پودوں کے قریب ایک نیلگوں چشم یونانی بلبل بیٹھی سریلی سیٹیاں بجا رہی

تھی۔ جو صبح کی زندگی بخش ہواؤں میں مل جل کر کسی دکھی کی پکار
کی طرح مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ آہ کمبخت . . . یہ پرند ہمیشہ
میرے مشاغل حیات میں خلل اندازی کرتا ہے!

گرم موسم کی اس چمکیلی صبح یونانی دیوتا کی اس چھیڑ چھاڑ نے
میرے خواب پرست جذبات میں ایک تلاطم پیدا کر دیا۔ مگر یہ تلاطم
سمندر کے تلاطم سے بہت مختلف تھا۔ کیونکہ سمندری تلاطم میں
تو ایک وحشیانہ غصّے اور تکبّرانہ جلال کے آثار ہوتے ہیں۔ مگر اس
تلاطم میں ایک سرور آگیں کیفیت ملی ہوئی تھی۔ جو میرے جسم و
جان کو جاڑوں کے گلاب کی طرح شگفتہ اور دل و جذبات کو مٹی
کی سوسن کی طرح متبسّم کر رہی تھی!

آہ . . . ! میری بیوگرافی میں اس خوش گلو پرندے کی
سیٹیوں کا بہت بڑا دخل ہے۔

مجھے یاد ہے۔ کہ اس شعر و نغمہ کی عاشق چڑیا نے میرے مشاغل
حیات میں کس کس طرح خلل اندازی کی ہے!

رات کا وقت تھا۔ اور آپ کو معلوم ہے۔ کہ مشرقی ممالک
کی راتیں کیسی پر افسوں ہوتی ہیں . . . میں کمرے میں بیٹھی
اپنی ایک نظم لکھ رہی تھی۔ نیلے آسمان پر تارے چمک رہے تھے

جیسے نیلی آنکھوں میں روشنی جگمگا رہی ہو۔ ٹہنیاں رات کی خاموش
ہوا سے جھوم رہی تھیں ۔ اور چڑیوں کے گھونسلے نیند سے ڈھکے
ہوئے تھے + دریچے کے پاس ہندی شاعروں کا محبوب مطرب
گرم موسم کا ایک بھونرا رسیلا گیت گا رہا تھا . . . ’ معبود جانے وہ
نارنگی کے خوشبودار پتّوں میں کہاں چھپی بیٹھی تھی ۔ کہ دفعتاً بالکل
اچانک طور پر کیٹس کی اس خوش گلو اور دل پسند محبوبہ نے . . .
یا یوں کہئے کہ یونانیوں کے نغمہ و عشق کے دیوتا نے اس زور کی
سیٹی سامنے تاریکی میں نارنگی کے درخت پر بجائی کہ مجھے تو ایسا
محسوس ہوا ۔ کہ میرے ساتھ ہی رات کی تاریکیاں بھی لرز گئیں !
. . . اور آہ ... !! وہ رات بھی کیسی عجیب اور پُر تاثیر رات تھی!
گرم ممالک کی افسانوی رات ! وقت سنسان تھا ۔ فاختہ زور
زور سے پانی کے راستوں پر چلّا رہی تھی ۔ دریائی طوطے اور دوسری
مرغابیاں دور کے مقامات پر بول رہی تھیں ۔ آسمان سے ایک
پراسرار مسکراہٹ برس رہی تھی ۔ اور زمین پر ایک دھیمی مسرّت
کا سایہ تھا ۔ دنیا مجھے ایک جزیرۂ خواب نظر آتی تھی ۔ نارنگی کی
ایک سبز ٹہنی پر بلبل نغمہ سرائی کر رہی تھی ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا
جیسے خواب کے راستوں پر کوئی فرشتہ بیٹھا نجات کا بگل بجا

رہا ہے۔

آج اس واقعہ کو دو سال گذر گئے۔ اس اثنا میں مَیں نے کئی مضامین اور کئی افسانے لکھے۔ مگر میری وہ نظم ادھوری ہی رہ گئی۔ جن جذبات سے متاثر ہو کر میں نے وہ نظم لکھنی شروع کی تھی۔ وہ بلبل کی گیت کی لَے میں ڈوب کر اس موج کی طرح جو سمندر میں غائب ہو جاتی ہے۔ ہمیشہ کے لئے گم ہو گئے! . . . چاہتی ہوں کہ اس نامکمل نظم کو بلبل کے نام سے منسوب کر دوں۔

کوئی شک نہیں۔ کہ رات کے سناٹے میں سرو کا درخت بھی گاتا ہے۔ اس کی موسیقی ہم کو عبادت الٰہی کی طرف کھینچتی ہے اس میں بھی کلام نہیں کہ ٹینی سن کا "چشمہ" بھی بیٹھے ترانے الاپتا ہے۔ اور اس کی آواز ہم کو کھینچ کر نیچر کی شفقت پناہ آغوش میں سونپ دیتی ہے۔ مگر بخدا . . . کیٹس کی بلبل کے ترانوں کی بات ہی جدا ہے۔ اس کی ملکوتی موسیقی ہم کو آدم و حوّا کے قصے کی یاد دلاتی ہے۔ ہم کو "بہشت گمشدہ" کے فسانے سے عشق دلاتی ہے۔ دنیا کی کوئی موسیقی اتنی جاں نواز اتنی رومانوی نہیں۔ جتنی ایک عندلیب کی!

مَیں نے سمندری موجوں کی موسیقی کے متعلق وہ کہانی آج

کو نہیں سنائی؟ وہ مجھے حفظ ہے۔ کہتے ہیں پُرانے زمانے میں ساحلِ نیل پر ایک دفعہ گیتوں کا بادشاہ بیٹھا اپنی محبوبہ سے اظہارِ عشق کر رہا تھا۔ وہ اپنی آواز پر بڑا نازاں تھا۔ اتنے میں ایک یونانی بلبل نغمے الاپتی ہوئی اس کے سر پر سے اُڑ گئی۔ اور نغمہ و سرود کا شہنشاہ دریائے نیل کی الڑھ موجوں میں کود پڑا۔ کیونکہ بلبل کا گیت سننے کے بعد اس کو اپنی آواز میں کوئی موسیقیت محسوس نہ ہوتی تھی۔ اسی وقت سے تو سمندری موجیں ایک وحشت خیز گرج کے ساتھ راگ گاتی ہیں۔ سینکڑوں لوگ آج سمندر کی آواز کو سنتے ہیں۔ مگر کسی کو یہ خواہش پیدا نہیں ہوتی۔ یہ خیال نہیں ستاتا۔ کہ اس غم و غصّہ کی گرج کا راز معلوم کریں۔

آہ . . . اے رومانوی روح!

خوش گلو اور راتوں میں گانے والی! . . . اے تو جو آسمانی ہوائی سلطنتوں کے سکون کو اپنی آواز کے ترنم سے درہم برہم کر دیتی ہے . . .

. . . جو ہماری روح کی خوابیدہ مسرتوں کو بیدار اور ضمیر کو آلائشوں سے پاک کرتی ہے . . . تو دنیا میں صرف اس

لئے بھیجی گئی ہے کہ انسان اور الوہیت کے درمیان ترجمانی کی خدمت انجام دے!

تیرے لہجے ہمیں دنیا کے پرانے پرانے قصّے یاد دلاتے ہیں... اور تیری آواز میں ہم کو دنیا کی تاریخ نظر آتی ہے... آدم کا عشق اور مریم کے تقویٰ کی کہانی از سرِ نو ہمارے خیالات پر مسلّط ہو جاتی ہے۔

انسان کی رنجیدہ مسکراہٹ اور نیچر کی پژمردہ خوشی تیری آواز کی آغوش میں پہنچ کر ایک طویل اور موثر گیت کی صورت کائنات میں گونج اٹھتی ہے۔

ہماری روحیں دنیا میں تکالیف و مصائب، اضطراب و بے امنی کے غیر دلچسپ اور ڈراؤنے خواب دیکھنے کے لئے بھیجی گئی تھیں۔

مگر... اے حسن و عشق کے خوب صورت دیوتا۔ تیرے نغمے ہماری خوابوں کی وادی کو مرتعش اور تیرا حسن ہمارے تخیل کے راستے کو منور کر رہا ہے۔

اے قدرت کی بہترین اختراع!

کتابِ دوستی کا ایک دل خراش ورق

باغِ ہستی میں بڑھے نخلِ تمنّا تیرا
مرے اس ٹوٹے ہوئے دل کو زیاں اچھا ہے

دوست

ایامِ گزشتہ میں جب شاعر کا کوئی دیوان میں کسی کھلے ہوئے شاداب دریچے کے آگے کھڑے ہو کر کھولتی تھی۔ اور اس میں بے وفائیوں۔ بے اعتنائیوں اور انقلاباتِ جہاں کا تذکرہ پڑھتی تھی۔ تو ایک قاتلانہ تبسّم۔ ایک مغرورِ حقارت کے ساتھ شانے ہلا دیا کرتی تھی۔ شاعرانہ مبالغہ۔ عاشقانہ دروغ سمجھا کرتی تھی۔ اس شانِ بے نیازی اور وقارِ سلطانی کے ساتھ جو میری فطرت

کا طرۂ امتیاز ہے۔مسکراتی اور شاعروں کا مضحکہ اُڑاتی ہوئی۔باغ کی آخری روش پر چلی جاتی تھی۔جہاں بے وفائیوں۔طوطا چشمیوں پر غور کرتی ہوئی ہری ہری گھاس پر بربط بجاتی ہوئی بیٹھ جاتی تھی . . .

تالاب کے نوجوان کنول۔میری اس ناتجربہ کاری پر مسکرا دیتے۔بلبل ہارسنگھار کی نازک ٹہنی پر بیٹھی۔میری اس بے دردی پر ایک آہ دل خراش کھینچتی۔سوسن وسنبل میں میری اس حرکت پر سرگوشیاں ہوتی تھیں۔اور میں . . . بدستور اپنا بربط بجاتی ہوتی!

اللہ کیا دن تھے۔جو گزر گئے . . . کیسا اچھا وقت تھا۔جو یکایک چلا گیا۔آہ . . . اب وہ تمام کم سنی کی ناتجربہ کاریاں۔بچپن کی بے فکریاں خواب و افسانہ ہو گئیں۔

اب جب کبھی خزاں کی سنسان دوپہر میں شاعر کی کوئی ایسی نظم جس کا موضوع "بے وفائی" ہوتا ہے۔پڑھنے لگتی ہوں۔یا انگلستان کے مایہ ناز شیلے کی وہ دل گداز نظم جس میں اس نے اپنی زندگی کو ایک "خالی پیالے" سے تشبیہہ دی ہے۔میری نظر سے گزرتی ہے۔تو اے میرے رفیق یقین کرو۔میرا جسم بید

مجنوں کی طرح لرزاں ہوجاتا ہے ۔ اب میں سوچتی ہوں ۔ کہ اللہ! آخر اس تغیر عظیم کا سبب کیا ہے ؟

مگر گزشتہ دنوں کا خیال کر کے آج کا مطالعہ کرتی ہوں ۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے ۔ جیسے کسی نے مجھے ایک غار میں دھکیل دیا ہو ۔ مہینوں کی یک جائی ۔ ہم مکتبی اور ہم نشینی نے آپس کی اجنبیت کو جان سے مار ڈالا تھا ۔ پر آہ کس کو خبر تھی کہ یہ سخت جان پھر زندہ ہو جائے گی ۔ حالانکہ یہ حضرت مسیح کا زمانہ بھی نہیں ۔ ۔ ۔ ؟

میرے معبود! دنیا کا یہ کیا ہی دل شکن واقعہ ہے کہ ایک دوست دوسرے سے بے وفائی کر جائے !

محب و محبوب اپنے دوران محبت میں ایک زمانہ بعد ایک نامعلوم بیزاری غیر محسوس تکان محسوس کریں ۔ تو یہ کوئی غمگین فسانہ نہ ہوگا ۔

مصور کچھ دیر بعد اپنے نقوش سے تھک جائے ۔ تو یہ کوئی رنجیدہ حادثہ نہیں ۔

اگر ہم اپنی زندگی کو ایک افسردہ خواب سمجھیں ۔ تو یہ کوئی بیجا خیال نہ ہوگا ۔

کیونکہ یہ تمام باتیں خلاف فطرت نہیں ہیں ۔ انسان خواہ

کیسا ہی صابر اور متحمل مزاج کیوں نہ ہو - ایک خاص حد پر پہنچ کر یکسانیت سے تھک جاتا ہے - مگر آہ ــــ سب سے زیادہ دل خراش بات تو یہ ہے - کہ دوستی میں بے وفائی کی جائے ؛

میرے خیال کے مطابق - دو انسانوں میں محبت چند دن چند ہفتے - چند ماہ - یا کہیں کہیں چند سال بھی قائم رہ سکتی ہے - اور اس کے بعد اس میں رکاوٹیں - موانعات - بے لطفیاں اور بے اعتنائیاں پیدا ہو جاتی ہیں ؛ یہ سب حیات معاشقہ کی تکالیف سمجھی جاتی ہیں . . . لیکن دوستی کا معیار سب سے بلند ہے - اس کا مرتبہ سب سے اونچا - اس کا جذبہ بہت پاک اعلیٰ وارفع ہے ؛ اس لئے بہادر قوم کی دوستی . . . بے لوث و بے غرض دوستی کو حیات انسانی کا ایک زبردست اور ابدی معاہدہ ہونا چاہئے دنوں - مہینوں - سالوں کے ساتھ ساتھ سلسلہ دوستی کو بھی مضبوط ہونا چاہئے - پر آہ . . . دنیا میں ایسے دوست بہت کم ملتے ہیں - جن کا دل دل سے ملتا ہو ؛

تم نے اس کتاب کو وقت سے پہلے بند کر دیا - تم نے اس سبق کو پڑھا ہی نہیں - اس لئے میں کوشش کرتی ہوں - کہ تم کو یہ سبق پھر ایک دفعہ ذہن نشین کر دوں ؛

سنو! میری زندگی کا سب سے ہولناک سب سے المناک واقعہ یہ ہے۔ کہ ایک زمانہ میں مجھ سے دل کھول کر دوستی نہایت خلوص و محبت سے کی جائے۔ اور دوسرے زمانہ میں وہی شخص مجھ سے بے اعتنائی و بے وفائی سے پیش آئے + یوں مجھے تمہاری بے اعتنائی کی پرواہ نہ ہونی چاہیئے۔ تاہم میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں۔ کہ "دوستی" دنیا کی بہترین "رشتہ داری" ہے + اس سے میٹھا اور کوئی رشتہ نہیں ہو سکتا + اس معاملہ میں میں طالب و مطلوب محب و محبوب کے رشتے کو بھی اہمیت نہیں دیتی۔ کیونکہ ان لوگوں کا مطمح نظر کچھ اور ہوتا ہے۔ جیسا تم نے ناولوں میں پڑھا ہو گا + والدین کا اولاد سے فطری رشتہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان سے محبت کرنے پر مجبور ہیں۔ بہن بھائی کو اس لئے پیار کرتی ہے کہ وہ اس کا بھائی ہے +

مگر یاد رکھو کہ دوستی . . . ہاں دوستی ان تمام کروہات سے پاک ہے لیکن ان تمام قیود سے آزاد ہونے کے باوجود انسان کی شرافت کا پورا پورا امتحان لیتی ہے +

اگر تم مجھے نہ جھٹلاؤ اور ایمان داری سے کہہ دو۔ تو تمہیں یاد ہو گا۔ کہ نومبر کی ایک سرد خوشگوار اور اندھیری شام میں تم اور میں

باغ میں ایک گیج کے کوچ پر صنوبر کے شان دار درخت کے نیچے بیٹھے تھے + وہ سردیوں کی شام تھی۔ تم نے اپنا "اوورکوٹ" پہن رکھا تھا۔ اور میں نے اپنا "فر" زیب گریبان کیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ کہ اس شام میں حلق کے درد سے کچھ پریشان تھی کچھ کچھ برف باری شروع ہوگئی تھی۔ میرا سفید اطالوی النسل کتا "ریکس" ہمارے سامنے کھیل رہا تھا۔ اس وقت ہم دونوں عمر خیام کے چند اشعار دوستی کے متعلق پڑھ رہے تھے۔ اور سمجھ رہے تھے کہ دونوں زندگی بھر اس کو نبھائیں گے ∴

دفعتًہ تمہاری نیل گوں آنکھوں میں ایک روشنی چمک آگئی۔ اور تم نے ہاتھ بڑھا کر "مجھے نہ بھولو" FORGET ME NOT کا پھول توڑ کر میری طرف بڑھایا۔ میں نے انا دانی سے یا دانائی سے اس کو بخوشی لے لیا۔ میں نے یہ اقرار دوستی عقلمندی سے کیا ہو یا بے وقوفی سے مگر اب تک اسی پر قائم ہوں۔ اور قول کو نباہنا میری قومی صفت ہے . . . کیا تم نے مسلمانوں کی شرافت کی مشہور کتابیں نہیں پڑھی ہیں۔ تم نے بغداد کے افسانے نہیں سنے ؟

اس کے بعد ہم دونوں قہوہ پینے کے لئے مکان میں آگئے

طعام خانے کے تمام دروازے۔ دریچے سردی کی وجہ سے بند تھے۔ برقی روشنی سے کمرہ بقعہ نور تھا۔ اور بڈھی منتظم خانہ ہمارے آگے قہوہ کی بے ڈنڈی پیالیاں رکھ رہی تھی۔ اس وقت میں تم سے اپنی آیندہ سیاحت امریکہ کے متعلق رائے لے رہی تھی۔

تمہیں معلوم ہے کہ میں سیر و سفر کی شوقین ہوں۔ اور چونکہ ایک خیال پرست فسانہ نویس عورت ہوں۔ اس لئے دن میں اسی کے خواب دیکھا کرتی ہوں۔ تم بھی مجھے بڑی توجہ اور شوق سے رائے دیتی رہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت تم میرے "ریکس" کو ہالینڈ کے پنیر کا ایک ٹکڑا کھلا رہی تھیں۔ کہو کہو . . . وہ شام تمہیں اب ذرا بھی یاد ہے۔ وہ وقت؟ جواب گزر گیا ہے . . . وہ ساعتیں جو اب بچھڑ گئی ہیں؟

آہ . . . اس کے بعد تمہاری طالب علمی کا زمانہ ختم ہو گیا . . . تم چلی گئیں۔ ادھر میرا دل بیزار ہو گیا . . . میں نے بھی لکھنا پڑھنا ترک کر دیا . . . وہ جگہ سنسان ہو گئی۔ جہاں ہماری دوستی پیدا ہوئی تھی . . .

اب صرف وہاں خلیج بنگالہ کی نیلی موجیں ساحل سے ٹکرا ٹکرا کر واپس چلی جاتی ہیں . . . اور اس سنسان ساحل کی

المناک ہواؤں میں . . . صرف ایک آواز گونجتی رہ گئی ہے
. . . جو کبھی کبھی اس زمانہ کی رنگین بہاروں کی یاد تر و تازہ
کر دیتی ہے ۔ کہ ؎

ما نہ ماندیم بجائے خود و دوراں بگذشت
جذبۂ اُلفت جاناناں ہمانست کہ بود

انسان کے دو پہلو

انسان کے ایک پہلو میں فطرت کا دریا لہریں مار رہا ہے!
جس میں مسرت۔ آزادی اور روشنی ہے!
مسرت۔ جو ضمیر کو شگفتہ اور پاکیزہ کر دیتی ہے۔
آزادی۔ جو روحوں کو نجات دلاتی ہے۔
روشنی جس میں ہماری تقدیر کے ستارے تیرتے ہیں۔
انسان کے ایک پہلو میں فطرت کا دریا لہریں مار رہا ہے!
ہرے ہرے مضبوط درخت۔ جو ہمیں زندگی کے پرخطر طوفانوں
سے جد و جہد کرنا سکھاتے ہیں!
لامحدود سمندر۔ جو ہمیں افراط اور وسیع النظری کا سبق پڑھا

رہا ہے ؎

اونچے پہاڑ اور مضبوط چٹان ۔ جو ہمیں استقلال اور شجاعت کی تعلیم دیتے ہیں ؎

سے انسان کے ایک پہلو میں فطرت کا دریا لہریں مار رہا ہے!
جس میں مسرت ۔ آزادی اور روشنی ہے!

پر آہ ․․․․ اس کے دوسرے پہلو میں دنیا کراہ رہی ہے!
جس میں موت ۔ بیماری اور فکر ہے!
موت ۔ جو محبوب کو ہم سے چھین لیتی ہے ؎
بیماری ۔ جو موت کا پیش خیمہ ہے!
فکر ۔ جو ہماری روحانی روشنیوں کو ناپاکی کی تاریکی میں فنا کر دیتی ہے ؎

آہ! انسان کے دوسرے پہلو میں دنیا کراہ رہی ہے!
مفلسی ۔ جو ہمارے روح کے پھول کو ذلت اور بزدلی کے تند جھونکوں سے مرجھا دیتی ہے ؎
تغافل حبیب ۔ جو ہم کو خدائے محبت کا منکر بنا دیتا ہے!
غرور ۔ جو ہمیں انسانیت کے پہلو سے دھکیل کر شیطانیت

کی آغوش میں دے دیتا ہے!

آہ! انسان کے دوسرے پہلو میں دنیا کراہ رہی ہے!

جس میں موت۔ بیماری اور فکر ہے!

گلاب کی سوانح عمری

میں اس مضمون کو "سرزمین گلاب" پر سونے والے شاعر عمر خیام
کے نام سے معنون کرتی ہوں ۔

ہم کیا کہیں کہ کون ہیں سودا بقول درد۔
جو کچھ کہ ہیں سو ہیں مگر آفت رسیدہ ہیں

گلاب! سرخ گلاب!!
آپ نے موسم بہار کے سینکڑوں ہی رنگین گلاب دیکھے ہوں گے ۔ خدا سرسبز رکھے خود آپ کے پائیں باغ میں مختلف رنگ کے گلاب ہوں گے ۔ زرد ۔ سرخ ۔ سفید ۔ پیازی ۔ غرض انواع و اقسام کے گلاب آپ کی نظر سے گزرے ہوں گے ۔

ایران . . . سرزمین عشق وحسن ایران کے مشہور گلاب سے بھی آپ متعارف ہوں گے؟ "چمن عمر خیام" کے گلاب سے بھی بہ حیثیت شاعر ہونے کے آپ کو عشق ہو گا؟ . . . مگر میرا روئے سخن "سرخ گلاب" سے ہے۔ ایسا سُرخ گلاب جیسے خون!

آسکر وائلڈ نے شاید آپ کو گلاب کے متعلق چند سال ہوئے ایک قصہ سنایا تھا۔ کہ گلاب بلبل کے "خون دل" سے سرخی حاصل کرتا ہے۔ کیا خوب صورت جھوٹ ہے۔ مگر یقین کیجئے۔ گلاب ایسا سنگ دل ہرگز نہیں۔ اگرچہ میں اپنے ادبی برادر آسکر وائلڈ کی مخالفت کرنا نہیں چاہتی۔ مگر میں چاہتی ہوں۔ کہ آپ آج گلاب کی "بیوگرافی" سے واقف ہو جائیں *

جو کہانی اب میں آپ کو سناؤں گی۔ وہ ہمارے بھائی آسکر وائلڈ مرحوم کے قصے سے کسی قدر بلکہ یوں کہئے۔ بالکل مختلف ہے۔ مختلف ہے۔ اور سچی ہے . . . !

آپ کو کہانی سننے کا شوق ہے۔ تو میں اس کی سوانح حیات سنانے کو تیار ہوں۔ مگر کہتے ہیں۔ کہانی دن کو نہیں کہی جاتی اس سے مسافر اپنا راستہ بھول جاتے ہیں۔ تو خیر آپ کو اختیار

ہے۔ آپ اس کہانی کو رات ہی میں پڑھیئے۔ لیجئے سنئیے:-

اب جگر تھام کے بیٹھو میری باری آئی

اگلے دیوتاؤں کے زمانے میں سرچشمۂ علم و فلسفہ۔ یا ذرا شوخ لہجے میں کہنے کا شوق ہو۔ تو اس طرح کہئیے۔ سرزمین اصنام یعنی ملک یونان کے ایک ننھے سے قصبے "کارنت" میں ایک رشک ماہ و مہر غیرت حور و پری دوشیزہ تھی۔ جس کا نام "رہوڈانٹ" تھا جی ہاں رہوڈانٹ! آپ کہانی ذرا دل لگا کر سنئیے!!

تو پھر کیا ہُوا . . . ! رہوڈانٹ کو آپ اگر ایک لمحہ بھی خدانخواستہ خدانخواستہ نظر بھر کر دیکھتے۔ تو شیطان کے کان بہرے۔ آپ کی بھی وہی حالت ہو جاتی۔ جو کبھی طُور پر موسیٰ کی ہوئی تھی۔ یا صاف صاف یوں کہئیے۔ کہ آپ کی دونوں آنکھیں . . . بس اَور کیا کہوں۔ آپ خود ہی سمجھ جائیے۔

تو یوں سمجھئیے۔ کہ یہ عورت اک "آتش خوش رنگ" تھی۔ اس کے آفتاب حسن کی بے پناہ کرنیں برچھیاں بن کر مشہور عالم تاج داروں کے دلوں کو چھلنی کئے دیتی تھیں۔ خدا پناہ میں رکھے مخلوق پر عجب عذاب نازل ہُوا تھا۔ عورت کا ہے کو ہوئی بلا تھی۔

ہر صبح کو یونان کی اس غیرت حور بیٹی کی خدمت میں تحفہ محبت پیش ہوتا - اور ہر شام واپس کر دیا جاتا ۔ اب آپ خیال تو کیجئے - کہ یہ سلسلہ کس قدر مضحکہ انگیز ہے ! رہوڈانٹ ان مختلف تاج داروں کے "تحائف محبت" سے بہت بیزار اور خفا تھی - وہ بہت پاک باز اور خود دار تھی - وہ مصر کی "کلیوپیٹرا" نہ تھی - بلکہ یونان کی عصمت مآب "رہوڈانٹ" تھی ۔ آج تک مہندی کے پتے جب کبھی خزاں کی ہواؤں سے جھوم کر گانے لگتے ہیں - تو ایک ہی گیت گاتے ہیں - اور وہ رہوڈانٹ کی عصمت وعفت کی تعریف کا گیت ہے ۔

اب سنئے - اِدھر شاہان عالم اپنی ضدی عادت سے معذور ادھر پاک باز دوشیزہ اپنی خوددار فطرت سے مجبور - آپ کو اس موقع پر یقیناً وہ مصرع یاد آتا ہو گا - کہ

"تم ادھر مجبور ہو - اور ہم اُدھر معذور ہیں" ۔

جب وہ سفید یا کاسنی رنگت کے لمبے لمبے کٹوریوں کی وضع کے پھولوں کے باغیچے میں صبح شام چہل قدمی کرتی - تو شاعر اس کی تعظیم میں بے تاب ہو کر نظمیں گانے لگتے ۔

غرض حسن نہ ہوا - غریب کی جان پر عذاب ہو گیا - آخر

تا بکے۔ اب متواتر پریشانیوں نے مظلوم اور نازک مزاج دوشیزہ کو برہم کر ہی دیا۔

عورت کا انتقام اور غصہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کس غضب کا ہوتا ہے۔ اب رہوڈانٹ کو بھی غصہ آ گیا تھا وہ تنگ آ کر نفاست کے سفید رنگ یونانی دیوتا "آرٹیمس" کے مندر میں پناہ گزیں ہوئی۔ چھپ گئی! چھپ گئی!!

پر ہائے! غارت کرے خدا۔ اس کے مشاقوں نے وہاں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اور مندر کے اک اک دروازے کو زور زور سے پیٹنے لگے۔ اُن کے ہاتھ نہ دکھے ہوں گے؟ کیا معلوم! اور تو اور باشندگان کارنٹ نے بھی ان عاشقوں کی مدد کی۔ اور مندر کے مضبوط خوب صورت دروازے کو آخر توڑ کر دم لیا۔ دروازہ کھل گیا۔ کھل!

آپ کے کمرہ کا دروازہ کوئی توڑ دے۔ تو آپ کو کتنا غصہ آئے گا؟ اسی طرح اس سرکشی اور گستاخی پر نفاست و پاکیزگی کے سفید رنگ یونانی دیوتا "آرٹیمس" کو جلال آ گیا۔ اور جلال کس طرح نہ آتا بھلا؟ آپ ہی کہئے کس طرح نہ آتا بھلا؟ آیا اور ایسا آیا۔ جیسے اپریل کے مہینے میں آندھی آتی ہے۔ یا نومبر

کے مہینے میں طوفان۔ بالکل اسی طرح آیا۔ اس نے "طویلے کی بلا بندر کے سر" غریب رہوڈانٹ پر اپنا عتاب عجیب و غریب انداز میں نازل کیا۔ اس نے اس کو ہمیشہ کے لئے "سرخ گلاب" کی شکل میں تبدیل کر دیا۔

گلاب کی گہری سرخی۔ آج بھی۔ آج اتنی صدیوں بعد بھی غریب رہوڈانٹ کے رخسار کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔ اُف! افسوس اس بات کا ہے۔ کہ آج اس کا کوئی عاشق پردۂ دُنیا پر یہ سُرخ پھول دیکھنے کو موجود نہیں۔ ورنہ . . .

ہاں تو "رہوڈانٹ" کا حشر تو یہ ہوا۔ اور مندر توڑنے والوں کو پرجلال دیوتا نے "کانٹے" کا جنم دے دیا۔ جو آج بھی۔ آج اتنے زمانے بعد بھی سرخ گلاب کے نیچے موجود ہیں۔ گویا رہوڈانٹ کی محافظت کر رہے ہیں۔

قصّہ تو ختم ہوا۔ مگر ایک ضروری بات رہ گئی۔ وہ سن لیجئے۔ رہوڈانٹ کی پیدائش سے پہلے زمین "گلاب" سے ایسی ہی قطعی ناواقف تھی۔ جیسے ہم اپنے آئندہ خوابوں سے۔

خیر کچھ ہو۔ میری تو دعا ہے۔ کہ اے خدا اے خدا! ہمیں سزا ملنے ہی والی ہے۔ تو ہمیں بھی ہمارے گناہوں کی

پاداش میں کوئی اچھا سا محبوب مسکراتا ہُوا پھول بنادے

آمین!

ایک پرانے مقام پر چند گھنٹے

وہ خوشی بھی دید کے قابل ہے جب ہوتا ہے خوش
مضطرب کو مضطرب، مضطر کو مضطر دیکھ کر

پیاری "ط" خدا تمہیں دو ہزار سال زندہ رکھے - آمین -
کامل چھ سال بعد - الٰہی تیری شان . . . نصف مدت گذرنے کے بعد مجھے پھر ایک دفعہ اس سرزمین رومان و حسن پر قدم رکھنے کا سنہری موقع نصیب ہوا ہے - جہاں ہم نے اپنی زندگی کے چند بہت خوش اور روحانی خواب دیکھے تھے ۔

آہ! آخر پرانے مقام کی کشش مجھے پھر ایک دفعہ اس مقام پر کھینچ لائی ہے - جہاں کبھی ہم آباد تھے + تم تو جانتی ہی ہو "ہوسٹ

کوئی بارونق شہر نہیں۔ننھا سا قصبہ ہے جو پہاڑ کے دامن میں آباد ہے۔جس کے ایک طرف "دریائے تونگ بھدرا" بہتا ہے دوسری طرف پہاڑوں کی زنجیر چلی گئی ہے۔

۱۹۳۳ء کی ایک خوش گوار اور نہایت خنک صبح میں پھر اس پرانے مقام پر گئی۔اس دفعہ میں تنہا تھی۔ٹرین سٹیشن پر آہستہ آہستہ رک گئی۔میں نے جھانک کر دیکھا تو حسب معمول پلیٹ فارم ویران پڑا تھا۔بعض پرانے درخت اسی طرح کھڑے تھے۔دو چار میوہ مٹھائی فروخت کرنے والے دیہاتی اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔

میں ایک سرد آہ بھر کر چپ چاپ پلیٹ فارم پر اتر گئی۔ایک دیہاتی وضع کی تکلیف دہ اور مضحکہ انگیز گاڑی میں بیٹھ کر سٹیشن کی سنسان سڑک پر تناور درختوں کے سایوں میں سے گزرنے لگی + ایک ایک اینٹ۔ایک ایک درخت۔اور ایک ایک گلی کو غور سے دیکھ رہی تھی اور پرانی باتیں یاد آرہی تھیں

آخر گاڑی ایک موڑ پر مڑ گئی۔آہ۔وہ بازار کے راستے پر دائیں ہاتھ کو جانے والی پتلی سی سڑک!! جہاں عیدگاہ کی سفید دیوار تھی۔جہاں بیٹھ کر ہم گرمی کی لمبی لمبی دوپہریں باتوں میں

بسر کر دیا کرتی تھیں۔ تم ایک دیہاتی دوشیزہ کی طرح وہاں بیٹھ کر بھٹے کھایا کرتی تھیں۔ میں کتاب دیکھا کرتی تھی۔ آہ وہ دن۔ !!

وہ سڑک اب تک اسی حالت میں ہے۔ کسی قسم کا فرق اس میں نظر نہیں آتا۔ کبھی کبھی دیہاتی گاڑی اس پر گزرتی ہوئی نظر آ جاتی ہے۔ جب میں گاؤں میں پہنچی۔ تو قمریوں کی اداس آوازیں اسی طرح آنے لگیں۔ جیسے چھ سال پہلے دوپہر کے وقت آیا کرتی تھیں۔ دل پر اک چوٹ لگی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے آہ وقت! کیسی تیزی سے نکل جاتا ہے۔ وہ پرانے مناظر۔ وہ خوش دلی کی باتیں۔ وہ پرانے چہرے۔ وہ پہاڑ . . . جس پر دن بھر ہم لوگ گشت لگایا کرتے تھے۔ آہ آہ! ؎

قدیم صحبت احباب خواب تھی گویا۔
خیال صحبت لیل و نہار باقی ہے +

میں بے تاب ہو گئی۔ میں نے ضبط کر کے گاڑی بان سے التجا کی کہ خدا کے لئے وہ تھوڑی دیر رک جائے۔ کہ میں کتاب زندگی کے گذشتہ اوراق پر یہاں بیٹھ کر اچھی طرح نظر ثانی کر سکوں + چنانچہ وہ مجھے عیدگاہ کی سفید دیوار کے قریب سے ایک پرانی سڑک پر لے گیا۔ جہاں ہمارا پرانا نشیمن تھا "سلور ٹن"!!

سڑک پر آتے ہی "سلورٹن" کی مبارک اور اونچی عمارت نظر آئی پیاری رفیق! اسے دیکھ کر میری قلبی حالت کیا ہو گئی - اس کا اندازہ لگانا تمہارے لئے آسان نہیں - ایک چھوٹی سی دیوار کے پاس کھڑی ہو کر بغور اس عمارت کو پاگلوں کی طرح تکنے لگی + وہ پرانے دریچے - وہ قابل محبت سبز دروازے - وہ مانوس برآمدے - وہ صحن - وہ دیواریں . . . . پرانے مردہ خواب زندہ ہونے شروع ہو گئے - اب آفتاب بادلوں میں سے نکل آیا تھا - اور تمازت محسوس ہو رہی تھی - سائے دراز ہونے شروع ہو گئے تھے "سلورٹن" کی دیواروں اور درختوں پر دھوپ کا عکس اسی طرح پڑتا تھا - جیسے آج سے چھ سال پہلے پڑتا تھا - مرا دل ٹوٹ گیا - مری روح ایک آہ بن کر پرواز کر جانا چاہتی تھی - آہ پرانے مقام پر پہنچ کر آدمی کیسا مچل جاتا ہے میں نے محسوس کیا - کہ واقعی انسان کو اینٹوں اور پتھروں سے بھی شدید محبت ہو سکتی ہے + میں اُس وقت محبت کے جذبے سے دیوانی ہو رہی تھی - اور چاہتی تھی کہ یہاں کی ایک ایک چیز کو اپنے سے لپٹا لیں - اور عہد ماضی کے قصے سنوں اور سناؤں + بچھڑے ہوئے عزیزوں - گم شدہ سہیلیوں - بے وفا

طوطا چشم لڑکیوں کی شکائتیں کروں - اور دل کی بھڑاس نکالوں تو میں گاڑی بان کی نظر بچا کر سلورٹن کی دیوار تک بھاگ کر گئی اور دیوانوں کی طرح اسے چھو چھو کر دیکھا - آہ . . . وہ سفید اور سخت دیوار . . . جی چاہتا تھا - اس سے قیامت تک جُدا نہ ہوں - پھر پیچھے باورچی خانے کی دیوار کی طرف گئی - جہاں شہتوت کے درخت اور کواپریٹو سوسائٹی کی عمارت کی چھوٹی سی دیوار تھی - اور جہاں ہماری مدت قیام میں فقیر و بھک منگے آ کر کھڑے ہوتے تھے - آہ پیاری رفیق! شہتوت کے درخت کو دیکھ کر میں بے تاب ہو گئی - اس سے کچھ دیر باتیں کیں - گاڑی بان مری اس مجنونانہ حرکات کو غور سے دیکھ رہا تھا - اس نے مجھے غالباً پاگل سمجھ لیا تھا - جب آفتاب بالکل اوپر آ گیا - تو میں نے رسٹ ہاؤس کا رُخ کیا - آہ وہ پرانا رسٹ ہاؤس!! "ہاسپٹ" کا رسٹ ہاؤس!!! جہاں شام کے وقت ہم لوگ بیٹھے میوہ کھایا کرتے تھے - اللہ اللہ پرانے مقامات پر انسان کی روح کیسی منڈلایا کرتی ہے - کاش! تم مرے ساتھ ہوتیں - تو ہم دونوں مل کر اس پرانے مقام کا طواف کرتے - میں سڑک سے آہستہ اتر کر ایک پگڈنڈی

پر چلنے لگی جس کے اختتام پر ریسٹ ہاؤس تھا + اس مقام پر
چلتے ہوئے میری عجیب کیفیت ہو گئی - میں رونے روتے یکلخت
کھلکھلا کر ہنس پڑی - گاڑی بان نے متوحش ہو کر مجھے متشکی
نظروں سے دیکھا - اسے یقین ہو گیا - کہ میں بالکل پاگل ہو گئی
ہوں - اور کوئی خطرناک حرکت کروں گی + اسے کیا معلوم تھا -
مجھے ایک پرانا واقعہ یاد آ رہا ہے - جو اس کھیت کی پگ ڈنڈی
پر اس جگہ گزرا تھا - جہاں میں چل رہی تھی + تمہیں یاد ہو گا -
ایک دفعہ تمہیں اس کھیت میں کس قدر پریشان ہونا پڑا تھا -
اس راستے پر ایک لال رنگ کی گائے نے تمہارا تعاقب کیا
تھا - اور ہم بہت زور سے چلا کر بھاگی تھیں - میں اپنے بچاؤ
کے لئے ایک دیوار کے پیچھے بھاگ گئی تھی - آج بھی گائیں
اسی طرح چرتی نظر آتی تھیں - آسمان نیلا اور صاف تھا - یہ
ایشیا کے ممالک کا گستاخ آفتاب چمک رہا تھا - کبھی کبھی دور
سے کھٹ بڑی کی آواز آ جاتی تھی - ہر چیز جوں کی توں تھی
مگر آہ ! نہ تم تھیں - نہ وہ دن تھے - نہ وہ وقت - میں بدنصیب
تنہا چلی جا رہی تھی - میرے آنسو بہنے لگے - آہ وہ دن ! !
وہ صبح . . . وہ شام وہ دوپہریں . . . ! وہ بے فکری کے

دن! اب مجھے ورڈز ورتھ کی ایک نظم یاد آ رہی تھی :-

آہ وہ ابتدائے عمر وہ سن
وہ اُمنگوں کے سال وماہ وہ دن
ہر گھڑی قہقہے مسرت کے
روز و شب چہچہے لڑکپن کے
آج کی کچھ خبر نہ کل کا خیال
زندگی کا نہ کچھ اجل کا خیال
اور طولانی تھے وہ دن کیسے
آج کل کے ہوں ہیں دن جیسے
آہ وہ دن کہاں وہ رات کہاں
اپنے جینے میں اب وہ بات کہاں؟

اب یہ حال ہے۔ کہ نہ حال خوش گوار نہ مستقبل کی طرف سے اطمینان! کسے پتہ مری کشتیٔ عمر مجھے اس بحرِ ناپیدا کنار میں کھینچ کر کہاں سے کہاں لے جائے۔ خدا جانے تمہاری کیا حالت ہے تم غالبًا کوچین کے سنسان ساحلوں پر اپنے والد ماجد کے ساتھ خوش و خرم زندگی بسر کر رہی ہوگی۔ یا کسے خبر مری یاد میں مری طرح خون کے آنسو رو رہی ہوگی۔ میں ہمیشہ ماضی کی یاد میں

تڑپنے کے لئے پیدا کی گئی ہوں ۔ یہ چند سطریں میں نے شدّت گریہ اور عالم بے تابی میں رسٹ ہاؤس کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر لکھ دیں ۔ ابھی پوسٹ کرادوں گی ۔ ابھی تو میں نے کھانا بھی نہیں کھایا ۔ طبیعت سنبھلی اور دل ٹھکانے لگا ۔ تو انشاءاللہ کل ایک خط لکھوں گی ۔ بس خدا حافظ ۔ اپنے والد سے سلام کہو ۔

صدائے بیابان

شاعر کی نگاہ

جب ہماری نظر زمین کے کسی ذرا سے حصے پر پڑتی ہے
تو ہم کو صرف یہی محسوس ہوتا ہے ۔ کہ یہ ہمارے معبود کی پھیلائی
ہوئی لامحدود زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے ۔ اور کچھ نہیں!
پر یہ صرف ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہی نہیں ہوتا ۔ بلکہ اس
ننھے سے ٹکڑے میں بڑے بڑے قابل غور اور دلچسپ
راز پنہاں ہوتے ہیں ؛
اگر ہم اس ننھے سے زمین کے ٹکڑے کو کچھ دیر غور سے

دیکھیں۔ تو ہم پر آہستہ آہستہ اُن پودوں کی اُداس زندگی کے راز خود بخود منکشف ہونے لگتے ہیں۔ جو اپنی عمر کے بہترین ایام میں موسم کے بے جا ظلم کے سبب اپنی بے وقت اور نوجوان موت پر آہیں بھر رہے ہیں . . . جب کہ گزشتہ بہار کی ایک سوسن جواب "ایک بوڑھا پھول" کہلانے کے قابل ہے۔ موسم اور نیچر کی رحم دلی کی بدولت اپنی بوڑھی زندگی میں آج تک قہقہے لگا رہی ہے +

یہ سب کیوں ہوتا ہے؟ کیا نیچر قانون اور اصول انصاف سے ناواقف ہے؟

اس کا جواب دینے کے لئے ایک "غور کرنے والی نگاہ" کی ضرورت ہے +

یہ بالکل سچ ہے۔ کہ "نگاہ غور" (یا بالفاظ دیگر ایک پیدائشی شاعر پیدائشی مصوّر یا نقاش یا ایک سچے انسان کی نگاہ) ہم پر ایسے ایسے راز منکشف کر دیتی ہے۔ جو ہماری زندگی کو یقیناً بہت مفید بنا سکتے ہیں +

ہم ہر روز دور دور تک پھیلے ہوئے خوب صورت آسمان کو دیکھتے ہیں۔ اور کچھ نہیں سمجھتے۔ سوائے اس کے کہ وہ نیلے

آسمان ہی کا ایک حصہ ہے۔ حالانکہ اس پر ایسے بادل بھی منڈلاتے ہیں۔ جو ملک کو اپنے طوفانی اثرات سے آن واحد میں برباد کر دیتے ہیں۔ اور پھر اسی آسمان پر ایسے امید افزا بادل بھی آتے ہیں۔ جو شہر کے باشندوں کے لئے بے حد مفید ہوتے ہیں اور خالق کے رزق کو مخلوق تک پہنچاتے ہیں ❖

دنیا میں بہت کم ایسی نگاہیں ہیں۔ جو ایک موجیں مارنے والے سمندر کو دیکھ کر صرف ایک سمندر ہی سمجھیں ❖

ایک دفعہ میں نے اپنے ایک دوست سے دریافت کیا کہ وہ دنیا کے اس مشہور و معروف پہاڑ کے متعلق کیا رائے اور خیال رکھتے ہیں۔ جس کو ہمالیہ کہتے ہیں؟ . . . تو آپ نے فرمایا۔ کہ "وہ ایک بہت ہی اونچا پہاڑ ہے۔ جس کی فضا اتنی لطیف ہے۔ کہ اس کی لطافت کی برداشت نہ کر کے اس پر چڑھنے والا انسان مر جاتا ہے" ❖

ان کے اس جواب سے ظاہر ہے۔ کہ ہمالیہ ان کے لیے سوائے اس کے کہ وہ انسان کو ہلاک کرنے والا ایک قسم کا زہر ہے۔ اور کچھ نہیں!

ہماری نظر پر ہر روز شاہ بلوط۔ بادام اور صنوبر کے اونچے

اونچے درختوں پر پڑتی ہیں۔ مگر ہم کو کبھی اس کا خیال نہیں آتا۔ کہ وہ صرف ایک لمبا سا درخت ہی نہیں۔ بلکہ انسانی زندگی کی ایک بہت ہی دلچسپ تفسیر بھی ہے ٭

وہ صرف ایک سیدھا سادا درخت ہی نہیں۔ بلکہ اس کے ساتھ اس کے چمکدار سبز پتے۔ لچکدار خوب صورت شاخیں اور موسم سرما کے زبردست طوفانوں سے مقابلہ کرنے والا ایک نہایت مضبوط بھورے رنگ کا پیڑ بھی ہے ٭

اور اس کے ساتھ ہی وہ اتنا حساس ہے۔ کہ موسم خزاں کی پہلی صبح میں وہ اپنے پتوں سمیت زرد اور پژمردہ نظر آنے لگتا ہے۔ اور وہ اس حالت میں کھڑا رہتا ہے۔ تاوقتیکہ بہار کے شاداب جھونکے پھر اس سے اٹکھیلیاں نہ کرنے لگیں ٭

وہ سچے معنوں میں ایک پیدائشی شاعر کی زندگی بسر کرتا ہے! مغرب کے ملک الشعرا شیکسپئر نے اپنی جادو بھری زبان میں واقعی کیا خوب کہا ہے:۔

"خاموش زندگی درختوں میں زبانیں پاتی ہے،
اور بہتی ہوئی ندیوں میں کتابیں ٭
اور پتھروں میں نصیحتیں۔ اور ہر چیز میں بہتری" ٭

کہتے ہیں۔ کہ اس فصاحت و بلاغت کے کلام کو سن کر ایک احمق نے کہا" کہ یہ تو بالکل بے معنی ہے۔ ندیوں میں کتابیں اور پتھروں میں نصیحتیں! یہ تو محض واہیات ہے۔ یقیناً شیکسپیر کا یہی مطلب تھا۔ کہ کتابوں میں نصیحتیں اور ندیوں میں پتھر"!

یقیناً اپنے اشعار کی یہ تشریح سن کر شیکسپیر کی روح نے بھی دوسری دنیا میں قہقہہ لگایا ہوگا۔

ہمارے مشرق کے ملک الشعراء حضرت سعدی نے مندرجہ بالا مضمون کی تشریح اپنی تصوف کی زبان میں کی ہے

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار۔
ہر ورق دفتریست معرفت کردگار۔

اللہ شاعر کی زبان بھی کیا زبان ہوتی ہے! اس کا قلم صرف ایک قلم ہی نہیں۔ بلکہ جادو کی ایک چھڑی ہے۔ جو ہر ایک کو مسخر کر لیتی ہے۔

ایک انگریزی شاعر نے ایک دوسرے احمق کی ہجو ذیل کے اشعار میں اس طرح کی ہے:-

"ایک ندی کے کنارے پر اگا ہوا ایک گلاب۔ اس کے لئے صرف ایک زرد گلاب ہی ہوتا ہے۔

اس سے زیادہ اَور کچھ نہیں"*

ایسی ہی ایک اَور مثال ہے۔ کہ ایک مشہور و معروف شائق مصور کی شاہ کار تصویر کو دیکھ کر ایک بڑھیا نے حقارت سے کہا تھا:

"میں نے تو ایسا غروبِ آفتاب کبھی نہیں دیکھا"*

اس کے قریب کھڑے ہوئے مصور نے مسکرا کر جواب دیا

"بے شک خاتون! اور نہ کبھی تم دیکھو گی!

لطیف چیزوں سے لطف نہ اٹھا سکنا انسان کی بدترین بدنصیبی ہے*

الف لیلہ کی ایک رات

خزاں قریب ہے گل سے نہ دل لگا بلبل!

وہ اپنے چچا کے ساتھ کئی سال سے "کوہ نیل" کے سنسان ساحلوں پر قیدیوں کی سی اداس اور مضمحل زندگی بسر کر رہی تھی۔ اب اس کے پاس دنیوی شان و شوکت آخر کیا باقی رہ گئی تھی؟ نہ وہ خوب صورت محلات۔ وسیع باغات اور سجے سجائے کمرے یا شاہانہ دیوان خانے ہی تھے۔ جن میں وہ آج تک پلی بڑھی تھی۔ نہ وہ کنیزیں اور خانہ زادہی خدمت کے لئے حاضر تھے۔ جن کی قدیم صورتوں سے اسے دل چسپی تھی!

وہ تو ریاست مال شور ہی میں اپنی شاہانہ زندگی امیرانہ

حیات کے نشانات چھوڑ آئی تھی۔

آہ وہ زمانہ گزر گیا۔ کہ وہ مشرقی عجائبات اور آرام وعیش میں زندگی کے دن کسی خلیفۂ بغداد کی طرح بے فکری میں بسر کیا کرتی تھی۔

مگر تقدیر نے ساتھ نہ دیا۔ اور وقت چلا گیا۔۔۔ اب وہ صحرا کے ان کاسنی اور بنفشئی رنگت کے پھولوں اور سبز سبز گھاس کی نازک پتیوں اور پہاڑی ہواؤں میں تیرنے والی خوش گلو چڑیوں ہی کو اپنا بہترین رفیق سمجھا کرتی تھی۔

وہ گھنٹوں کسی بلبل کی مسحور صداؤں اور فاختاؤں کی غمناک آوازوں سے اپنا دل بہلاتی۔ ساحل کی سنسان چٹانوں اور سمندری ریت کے چمکیلے سفید اونچے اونچے ٹیلوں پر بیٹھ کر اپنی زندگی کا مسئلہ سوچا کرتی!

اس کو ایسا معلوم ہوتا۔ کہ سمندری موجوں میں جنّوں کا بادشاہ بیٹھا اس کی زندگی کے موضوع پر ایک دل گداز راگ الاپ رہا ہے!

کبھی وہ محسوس کرتی۔ کہ ہواؤں میں تقدیر کے فرشتے اس کی زندگی کے مسئلے کو سلجھا رہے ہیں۔ اور باتیں کر رہے ہیں!

اب اس کے پاس سوائے اپنی ایک "بیچاری زندگی" کے اور کیا باقی رہا تھا . . . ؟ زندگی - آہ جس کے متعلق سوچنے کے لئے ایک پوری عمر درکار ہے . . . ہاں زندگی !! جو قدرت کا بہترین عطیہ ہے - اور وہ بھی ایک عورت - ایک مشرقی پاکباز لڑکی کی پاکیزہ زندگی . . . آہ میں اس کو "الف لیلہ کی ایک رات" ہی کیوں نہ کہوں ؟

مُحبّت نامہ

کل رات جب میں کوچ پہ لیٹی تھی۔ تو میرا دل سینے میں زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ بید کی طرح لرزاں۔ اور شعلہ کی طرح بے قرار۔

وہ اوائل مارچ کی خوب صورت رات تھی۔ سولھویں تاریخ کا باسی چاند۔ آسمان کے کنارے پر۔ پہاڑ کے عقب میں چمک رہا تھا۔ دور . . . ندّی کی پرشور لہروں میں کوئی خرابِ محبّت نوجوان ملّاح اپنی کشتی میں بیٹھا غم کا گیت گا رہا تھا۔

لیکن میری نیند مجھ سے کوسوں دور تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ رات کی تاریکی اسے کہیں چرا لے گئی ہے۔ میں اپنی بسا

چمکیلی آنکھوں کو بند کرنے کی کوشش کر رہی تھی - پر وہ ضدی آنکھیں کب میرا کہا مانتی ہیں ؟ برابر کھلی جا رہی تھیں - اے مالک . . . یہ مجھے کیا ہو گیا ؟ نیند کی پری کدھر اُڑ گئی ؟

ساری رات مجھے نیند نہ آئی - باغ کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی - کہکشاں کے ننھے ننھے تارے جگمگاتے نظر آتے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا . جیسے آسمان بجائے خود صفحۂ قرطاس ہے - جس پر تارے الفاظ اور نقطے بن کر چمک رہے ہیں - آہ دوست کا محبت نامہ - دوست کے خط کا تخیل ؀

باغ کی آخری روش پر - زرد لیموں کے درخت پر کوئی ایک تنہا بلبل میٹھی نغمہ سرائی میں مصروف تھی - مجھے تو ایسا معلوم ہو رہا تھا - جیسے تمہارے ہی خط کے جملے دہرا رہی ہے ؀

مجھے رات کے جلدی گذر جانے کا انتظار تھا - کیونکہ آنے والی صبح . . . فرحت بخش - روح افزا صبح . . . مجھے اک خط پہنچانے والی تھی - ہاں سہیلی کا محبت نامہ - طویل اور پُر لطف . . . ننھے ننھے خوب صورت حروف میں لکھا ہوا - جاں نواز خط دوست کا خط - کیا آپ کو بھی دوست کے خط کا انتظار رہا ہے ؟ کیا آپ بھی انتظار کی فلاسفی اور اشتیاق کے پیچیدہ راز سے

آگاہ ہیں؟

میں رات کے سناٹے سے گھبرا گئی۔ تاریکی میں میرا دل کھو یا گیا۔ کمرہ تاریک پڑا تھا۔ صرف دریچے کی راہ سے۔ باسی چاند کی پژمردہ زرد سی روشنی۔ اک قد آدم آئینے پر چمک رہی تھی۔ ہر طرف اداسی تھی۔ ایسی اداسی۔ جیسی چاندنی راتوں میں قبروں کے پاس ہوتی ہے+ میں تنہا تھی۔ اور بے حد متوحش! مگر . . . دوسری صبح کا خیال میری روح کو آمادۂ تبسّم کر رہا تھا۔ کل صبح دوست کا خط آنے والا تھا۔

خط! وہ خوفناک ساحلوں۔ مہیب جنگلوں عظیم الشان پہاڑوں کو عبور کر کے آ رہا ہے! میری طرف آ رہا ہے۔ اگرچہ راستہ کٹھن اور سفر پر خطر ہے۔ پر میرے شوق کی کشش۔ اور دل کا جذبہ۔ اسے اپنی طرف کھینچ لے گا۔

ننھے خط۔! دلچسپ مسافر! جلدی راستہ طے کر۔ اور ہوائی تیز پرند کی طرح اڑ کر چلا آ۔ کہ روح دُور افتادگی کے بوجھ سے دبی جا رہی ہے۔

نہ جانے بقیہ رات کیسے گذری۔ جب میں نے مڑ کر دیکھا۔ تو دروازہ کھلا ہُوا تھا۔ اور بوڑھی زوناش مُسکراتی ہوئی اک

خوب صورت سا لفافہ مجھے دے رہی تھی ؛
دریچے کی راہ سے صبح کا چہرہ مسکراتا ہوا نظر آرہا تھا ؛
اے اللہ۔ دوست کا خط !

وہ قدیم اُداس رات

وہ قدیم اداس رات ۔ ہائے ۔ وہ بچھڑے ہوئے وقت کی ایک بہت پرانی ۔ مگر بہت ہی اداس اور المناک رات ! جس کی سیاہی ۔ جس کی خاموشی ۔ اور جس کی اداسی آج بھی آج اتنے سالوں بعد بھی مری رُوح کو آمادہ گریہ کر رہی ہے ۔ اور قلب پر ایک عجیب کیفیت طاری کر دیتی ہے ۔

شاید اُس رات کے مختصر حالات سے آپ کو ۔ ۔ ۔ سننے والوں کو کوئی دل چسپی نہ ہو ۔ بہت ممکن ہے ۔ کہ میں آپ کو اُس بچھڑی ہوئی اداس رات کے حالات سنانے لگوں ۔ اور وہ آپ کو لغو معلوم ہوں اور آپ اکتا جائیں ۔ ۔ ۔ اور محض

اخلاقاً سنتے رہیں۔ مگر ادھر میری یہ کیفیت ہے۔ کہ جب بھی میں اس
زمانے کے حالات۔ اور اس رات کو یاد کرتی ہوں۔ تو گم شدہ
وقت کی کھوئی ہوئی دلچسپیوں میں گم ہو جاتی ہوں + شاید اس
لئے کہ اس مضمون کے کئی کیریکٹر اس دنیا میں موجود نہیں۔ وہ اب
ستاروں کی جگمگانے والی دنیا میں آباد ہو چکے ہیں۔ چنانچہ ان
کی سہانی یاد بھی خوش گوار خواب کی طرح دماغ پر چھا جاتی ہے
اس لئے خواہ یہ افسانہ . . . یوں کہئے افسانے کے چند الفاظ
خواہ آپ کو کیسے ہی بے معنی اور بیہودہ معلوم ہوں۔ دل کی
بے تابی مجھے مجبور کرتی ہے۔ کہ اپنی تسکین کے لئے یہ بے چین
جذبات حوالۂ قلم کر دوں :۔

اس شام میں افسردہ و مضمحل تھی۔ باوجود موٹے موٹے
بادلوں کے مغرب کا آسمان شفق سے سرخ تھا۔ سردی بالکل کم
ہو گئی تھی +

میں گزشتہ ایک ماہ کے بعض واقعات سے پریشان سی رہنے
لگی تھی۔ چنانچہ اس وقت بھی اداس طبیعت کو بہلانے کے لئے
باغیچے میں اتر گئی۔ اور سرخ گلاب کی جھاڑیوں میں چلی گئی +
ان دنوں میں جسوتی کے حالاتِ زندگی لکھ رہی تھی۔ اس وقت

بھی ناول کا ایک باب سوچ رہی تھی۔ جس میں گزشتہ ہفتے کے تمام واقعات ناولانہ انداز میں لکھنے تھے۔ مشرق سے نیلی نیلی گھٹائیں اٹھ رہی تھیں۔ دفعتاً شاہ بلوط انجیر اور بادام کے درخت ہوا کے تیز جھونکوں سے جھومنے اور بے چین ہونے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے رات خوب آندھی چلے گی + تھوڑی دیر میں ہوا کی تندی بڑھی۔ اور مری آنکھیں بند ہوگئیں۔ اسی وقت مجھے اپنی گردن پر کسی کی تین انگلیاں رکھی ہوئی محسوس ہوئیں میں بڑی حیران ہوئی۔ مڑ کر دیکھا تو کرنل صاحب کھڑے مسکرا رہے تھے + وہ مجھ سے کافی بے تکلف ہو چکے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ دو لمحے کرنل نے مسکراتے ہوئے مجھے بغور دیکھا پھر کہا تھا "آپ کے آگے شمشاد کا درخت ہوا سے کس طرح جھوم رہا ہے! آپ سے کچھ سرگوشیاں تو نہیں کرتا؟"

اس کے اس سوال پر اللہ جانے کیوں میں کسی قدر پریشان سی ہوگئی تھی۔ اُن ایام میں کرنل صاحب جسونتی کی موجودہ علالت اور خاندان کی غیر معمولی پریشانیوں کو دیکھ کر اس ٹوہ میں لگے رہتے تھے۔ کہ اصلی راز معلوم کریں + ابھی میں پریشان ہی ہو رہی تھی کہ انہوں نے کہا "ہاں تو آپ نے جواب نہیں دیا۔ میں نے

سنا تھا۔ خوب صورت پودے شاعروں سے بات چیت کرتے ہیں
کہیں یہ کسی کی زندگی کا راز تو آپ سے بیان نہیں کر رہا؟
میں کچھ چڑسی گئی بولی :"کرتا ہوگا۔ پھر اس سے آپ کو کیا؟"
کچھ ہنس کر کہنے لگے :" معلوم ہوتا ہے . . . خاتون روحی . . .
آج آپ کی ناک لال ہے؟"
"ناک لال" ہونے کا اس نے محاورہ بنا رکھا تھا۔ مجھے اُس
شام اس کی یہ بیہودگیاں بہت ناگوار گزر رہی تھیں۔ اس لئے
میں بت کی طرح خاموش کھڑی فوارے کی طرف دیکھتی رہی؟
" اوہ . . . " کرنل نے ذرا مسکرا کر کہا" آج ناک بہت
زیادہ لال ہو رہی ہے۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ مناسب یہی معلوم
ہوتا ہے۔ کہ میں فوراً یہاں سے دفع ہو جاؤں"۔
یہ سن کر اس وقت مجھے اس پر کسی قدر رحم آ گیا۔ بولی۔
"نہیں کرنل۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ آج میری طبیعت کچھ
پریشان اور متوحش سی ہو رہی تھی"۔
" خدا خیر کرے۔ وہ کیوں؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا" آج
تم باہر کیوں نہیں گئیں؟"
"آندھی آنے والی ہے۔ کیسے جاتی؟ چلئے اندر بیٹھیں"۔

"ایسے سماں میں اندر؟" انہوں نے سگار سلگاتے ہوئے کہا۔ "یہاں شفق کا منظر کیوں نہ دیکھیں؟ مشرق میں بجلی بھی چمک رہی ہے، آپ گرج سے ڈرتی تو نہیں؟ میں آپ کو ساحل پر چہل قدمی کے لئے لے جانا چاہتا تھا۔ پر موسم اس کی اجازت نہیں دیتا! . . . آپ تو واقعی حیرت انگیز طریق پر زرد ہو رہی ہیں!"

یہ سن کر میں گھبرا سی گئی تھی۔ الٰہی! اب کیا کروں؟ جھٹ میں نے کہا تھا "ہاں کرنل . . . شاید میں محنت سے ان دنوں زرد سی رہنے لگی ہوں"۔

"محنت؟ محنت کیسی؟ ہل جوتتی ہو؟ یا کنوئیں کی چرخی چلاتی رہیں؟"

کرنل کے اس انداز گفتگو سے مجھے پڑتی بولی "تم جانتے ہو ان دنوں میں وہ ناول لکھ رہی ہوں۔ جس کا اشتہار پچھلے ہفتے "بغداد ٹائمز" میں چھپا تھا۔ آج صبح سے ایک باب سوچ رہی تھی۔ شاید اسی محنت سے زرد ہو گئی"۔

کرنل کچھ سوچ کر بولے "اچھا! ناول۔ شاید جو کچھ دیکھ رہی ہو وہ لکھ رہی ہو؟"

مجھے یاد ہے یہ سن کر میں بوکھلا سی گئی تھی۔ اور کرنل کے چہرے کو بغور دیکھنے لگی تھی۔ مجھے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ڈر سا لگتا تھا۔ پر میں برابر دیکھے جا رہی تھی۔ اس وقت وہ بے پروائی کے انداز میں اپنے راکھ کے رنگ کی پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا۔ اور سگار پی رہا تھا۔ چھوٹی گہری نیلی آنکھوں میں ایک جستجو اور خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ سنہرے بال کبھی کبھی تیز ہوا سے پیشانی پر بکھر جاتے تھے۔

"چلو اندر چلو . . . " میں نے بے ساختگی کے لہجے میں کہا "تم نے شاید ابھی کونٹیس جسوتی کی نبض نہیں دیکھی؟"

یہ کہتے ہوئے میں اس کا سہارا لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ باغ سے جلدی سے گذر کر ہم دونوں اوپر کی منزل میں چلے گئے۔

خاتون جسوتی ایک ریشمی فیروزے رنگ کی شال میں لپٹی لپٹائی دریچے کے آگے کوچ پر نڈھال سی نیم دراز تھی۔ ہائے . . . وہ بچھڑا ہوا وقت! جونہی کرنل نے کمرے میں قدم رکھا مجھے یاد ہے۔ وہ حیران رہ گیا تھا۔ اور میں بھی دہشت سے دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔

"بلند آسمان کونٹیس!" کرنل نے چیخ نما آواز میں کہا تھا۔ یہ

آپ کی کیا حالت ہے؟ کوئی غیر معمولی محنت تو آپ نے نہیں کی؟ ٹینس تو نہیں کھیلی؟"

آہ جسونتی کا وہ ناتواں لہجہ مجھے آج تک نہیں بھولا۔ اس نے کہا تھا" کرنل صاحب میں تو کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ ٹینس کیا کھیلوں گی!"

اسی وقت کمرے میں ڈاکٹر گار داخل ہوا۔ کرنل نے ڈاکٹر گار کی طرف دیکھ کر پوچھا" کیوں جناب؟ مریضہ کی یہ کیا حالت ہے؟"

بوڑھا ڈاکٹر گار سناٹے میں آگیا۔ کیا جواب دے سکتا تھا کیا بول سکتا تھا! میں اس مختصر سی نشست گاہ سے پریشان ہو کر باہر نکلی۔ بالاخانہ کے زینے کے پاس ایک لمبا سا دریچہ کھلا ہوا تھا۔ وہاں جا کھڑی ہوئی + بجلیاں چمک رہی تھیں بادل گرج رہے تھے۔ مگر ابھی بارش شروع نہیں ہوئی تھی۔ باغ کے بڑے بڑے تناور درخت دریچے کے سامنے بڑے زور زور سے جھوم رہے تھے۔ گرد اڑ رہی تھی۔ مگر میں . . . ! چپ چاپ دریچے میں کھڑی کونٹ کے خاندان کے حالات پر غور کر رہی تھی + دل مسلسل پریشانیوں سے گھبرا سا گیا تھا۔

اسی وقت کرنل بھی نشست گاہ سے باہر نکل آیا۔ کہنے لگا: "میں کونٹیس کے متعلق ازحد پریشان ہو گیا ہوں . . ."

میں اس گفتگو سے بچنا چاہتی تھی۔ اس لیے انجان بن کر کہنے لگی: "اُف کرنل۔ بڑا وحشت ناک موسم ہے۔ سمندری موجوں کی آواز نہیں سنی تم نے؟ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے جنگل میں کوئی وحشی درندہ پکار رہا ہو"۔

مگر وہ کہاں چپ رہنے والا تھا بولا: "ہاں موسم نہایت وحشت ناک ہے۔ اس سے زیادہ وحشت ناک موجودہ حالات معلوم ہوتے ہیں۔ خاتون روحی میں یہ کہنے کی ضرور جرأت کروں گا۔ کہ کونٹس کی یہ بیماری ایک روگ ہے۔ ایک روحانی صدمہ ہے۔ دیکھنا پیاری یہ نہ سمجھنا کہ میں کوئی بچہ ہوں"۔ یہ کہتے ہوئے انہوں نے اپنی ایک انگلی میرے رخسار پر رکھ دی"۔ ایں بوکھلا کیوں گئیں؟ نہیں لڑکی نہیں . . . ! تمہاری کوششیں اب بیکار ہیں۔ صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ کونٹس جسوتی . . . کی شادی کے معاملے . . . ؟ محبت . . . خیر یوں کہو ان کی غیر معمولی طبیعت کی وجہ سے ان دنوں تم سب کے سب پریشان ہو رہے ہو؟"

"اتنا سن کر میں نے کرنل کو روک دیا تھا" خدا کے لئے لیبن!"
یہ کہہ کر میں نے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"اچھا اب میں جاتا ہوں۔ کل آؤں گا۔ خدا حافظ"
یہ کہہ کر اس نے میرا ایک ہاتھ لے کر زور سے ہلایا۔
کچھ دور گیا۔ پھر واپس آیا اور مسکرا کر ایک دو دفعہ مجھے ہلکے
سے ہلایا اور پھر نیچے اتر گیا۔

یہ سب واقعات مجھے ایسے ہی یاد ہیں جیسے کل کی بات
ہو۔ آہ! اس کے جانے کے بعد میں نے دریچہ بند کر دیا۔ اب
اچھی خاصی آندھی شروع ہو چکی تھی۔ خانساماں احمد اور بڈھی
زوناش نے محل کے تمام دروازے دریچے جلدی جلدی بند
کر دئے۔ آتش دان روشن کر دیا۔

شب کے آٹھ بجے تھے۔ وہ رات بڑی خاموش اور
اداس رات تھی۔ قبر کی طرح خاموش اور ویران! بیمار کی
طرح اداس اور پریشان اب تک مجھے یاد ہے! ہوا کبھی کبھی
زور کی سیٹی بجا دیا کرتی تھی۔ کبھی دور سے سمندر کی موجوں میں
سے ہو کر کبھی دریائی پرند کی چیخ سنائی دیتی تھی۔ ڈاکٹر گارا اوپر
کی منزل میں اپنے کمرے میں مصروف مطالعہ تھا۔ اب

جسونتی بھی نچلی منزل میں کم آیا کرتی تھی۔ میں نیچے تن تنہا گھبرا گئی۔ کچھ دیر کمرۂ ملاقات میں بیٹھی ٹرکی کے شیدائی اور مشرقی تمدن کے عاشق نذار ”پیری موتی“ کا ایک ناول دیکھتی رہی۔ مگر دل گھبرا گیا۔ اٹھ کر کوٹ پہنا اور دستانے کے بٹن لگاتی کچھ سوچتی ہوئی بالاخانے پر جسونتی کے کمرے کی طرف گئی۔

وہ اپنی مختصر سی نشست گاہ میں ایک سبز مخملی صوفے پر اداس لیٹی فانوس کو دیکھ رہی تھی۔ میں بھی اس کے قریب آگ کے پاس ایک کوچ پر نیم دراز ہو گئی۔ مجھے دیکھ کر پوچھنے لگی ”ردحی! تم شام سے نظر نہیں آئیں کہاں تھیں؟ کیا کرنل صاحب تم سے محبت کرنے لگے ہیں؟“

”نہیں تو جسونتی“۔ میں نے گھبرا کر کہا۔ مجھے اپنے ہارلی سے محبت تھی۔ اور وہ بھی شدید قسم کی محبت“!

جسونتی مسکرائی۔ اداس اور پژمردہ مسکراہٹ۔ بولی:۔ ”میرا یہ مطلب نہ تھا۔ کہ تم کرنل صاحب سے محبت کرنے لگی ہو۔ مری مراد یہ تھی کہ کہیں وہ تو تم سے محبت نہیں کر رہے؟“

”بالکل نہیں جسونتی۔ مجھے یقین ہے کہ نہیں۔ ان دنوں ہم دونوں باغ میں تمہارے متعلق سرگوشیاں کیا کرتے ہیں“۔

جسوتی بیچاری ڈر سی گئی ۔ " میرے متعلق ؟ ہائے ! یہ راز طشت از بام ہو کر رہے گا " ۔

" مگر ابھی تو کرنل کو کچھ بھی نہیں معلوم ۔ تم اطمینان رکھو ۔ میں ہرگز اس پر کوئی بات عیاں نہ ہونے دوں گی (شگفتہ لہجہ میں) رات کیسی سرد ہو گئی ہے ۔ ہلکی ہلکی آندھی چل رہی ہے اور اور موسم دلچسپ ہے ۔ قہوہ پئیں ؟ "

" ضرور . . . زونانش قہوہ . . . ! "

تھوڑی دیر کمرے میں سناٹا رہا ۔ ہم دونوں خاموشی سے آگ کو گھورتی رہیں اور قہوہ پیتی رہیں ۔ دریچوں کے شیشوں میں سے ہو کر بجلی کی چمک کبھی کبھی اندر آجاتی تھی ۔ اور خوف سے میں اپنی آنکھیں بند کر لیتی تھی ۔

دفعتاً جسوتی نے سوال کیا " روحی ! اب تو ہمیں یہاں آئے کئی مہینے ہو گئے ۔ " کوہ نیل " واپس جائیں ؟ "

اس زمانے میں گھر واپس جانے کے خیال سے مرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے ۔ کیونکہ گھر واپس جا کر ہمیں مختلف قسم کے حادثات اور واقعات سے دوچار ہونا تھا ۔ اس لئے میں نے تامل کر کے کہا " مگر مری جان . . . ! میرا خیال ہے ۔ تم

ابھی تندرست نہیں ہوئیں۔ نہ اتنی جلدی کرنل صاحب ہی جانے کی اجازت دیں گے"۔

جسوتی کی آنکھوں میں شاید اس وقت دو ایک آنسو بھر آئے تھے۔ وہ کہنے لگی:۔

"مگر روحی! میں جانا چاہتی ہوں + تم جانتی ہو خاندان میں عجیب پریشانیاں پھیل رہی ہیں + آہ غریب چچا! مرے غریب چچا! سچ تو یہ ہے۔ کہ میں گوتم بدھ کے اس قول کی بہت قدردان ہوں۔ اس نے کہا تھا۔ انسان کے لئے بہترین نعمت یہ ہوتی کہ وہ عالم ہستی ہی میں نہ آتا + تم ہی انصاف کرو۔ مجھ جیسی لڑکی کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے؟ لوگوں کو کیا حق ہے۔ کہ مجھے ستائیں؟ میں کیا کسی کی منکوحہ بیوی بن کر دنیا میں آئی ہوں روحی؟ پھر کیا وجہ ہے کہ لبریزی مجھے اس طرح تنگ کرنے ان کی ہٹیلی طبیعت مالک جانے اور کیا کیا گل کھلائے۔ بزرگوں نے انہیں کچھ حد سے زیادہ ناز پرودہ بنا رکھا ہے۔ وہ اک "بگڑا ہوا بچہ" ہو گئے ہیں۔ لوگوں نے اگر ان کے غیر معمولی حسن سے متاثر ہو کر انہیں "یونانی دیوتا" کا لقب دیا ہے۔ تو اس سے مجھے کیا؟ حسن کو محبت سے اور محبت کو حسن سے کیا تعلق روحی؟ فرض

کرو۔ کسی نے تم سے کہا کہ تم سرہار بی کی محبت کو چھوڑ دو۔ اور کسی اُور سے مثلاً البریزی سے محبت کرنے لگو۔ تو تمہیں غصہ نہ آنے لگا؟"

"مَیں تو اُسے جان سے مار ڈالوں جسوتی"۔ مَیں نے غصے کے لہجے میں کہا۔

جسوتی ہلکی ہنسی ہنس پڑی "دیکھا! تمہیں کیسا غصہ آیا؟ اب مرے جذبات کا اندازہ لگاؤ۔ اب تو بس مَیں نے تصفیہ کر لیا ہے۔ زندگی کا تصفیہ! اور یہ میری زندگی کا بہت عمدہ تصفیہ ہے"۔

میں التجا کے پیرائے میں کہنے لگی:"۔ کیا میں تمہاری زندگی کے تصفیے کو سن سکتی ہوں جسوتی؟"

"بے شک روحی" جسوتی نے کہا "تم میری محب صادق ہو۔ مرا تصفیہ یہ ہے کہ میں شادی ہی نہ کروں۔ تم جانتی ہو کہ میری شادی خاندان کے لئے مصیبت کا باعث ہوگی۔ سوچ کر روح لرزتی ہے"۔

"اچھا تو پھر تم کیا کرو گی؟" مَیں نے اضطراب کے لہجے میں پوچھا۔

"ہیں؟ . . . " جسونتی نے اپنے سگریٹ کی راکھ جدا کرتے ہوئے کہا۔ "میں روحی چلی جاؤں گی۔ لوگ کہتے ہیں . . . کہ ہمارے ان مشرقی گرم صحراؤں میں ایک دل فریب جادو۔ ایک پر اسرار افسوں پوشیدہ ہوتا ہے۔ میں ان صحراؤں کی راہب عورتوں میں مل جاؤں گی۔ اور مالک کی بندگی میں اپنی زندگی بسر کروں گی۔ تم اپنے وطن چلی جاؤ۔ افسانے لکھو۔ نظمیں موزوں کرو۔ دنیا میں شہرت حاصل کرو اور دولت کماؤ۔ ایک خوش نصیب لڑکی بن کر رہو۔ تم میری فکر نہ کرو"۔

میں نے رومال سے اپنے آنسو خشک کئے۔

"آہ جسونتی! آخر تم نے اپنی زندگی کا یہ تصفیہ کیا؟ ہائے تمہارے چچا! بچارے کا دنٹ لوٹ!"

مجھے اچھی طرح یاد ہے اپنے چچا کا نام سن کر اسے رقت آ گئی تھی۔ کہنے لگی "اسی لئے تو میں نے یہ تصفیہ کیا ہے۔ چچا کو مصائب سے محفوظ رکھنے کے لئے۔ روحی تم کو مرے اس تصفیے پر خوش ہونا چاہئے"۔

میں بمشکل کہہ سکی: "جسونتی! میں ایسی سنگ دل نہیں ہوں۔ بھلا اب پتھر کا کلیجہ کہاں سے لاؤں۔ جو تمہارے اس تصفیے پر

اظہار مسرت کر سکوں؟"

ہائے زندگی کی وہ بچھڑی ہوئی رات! مجھے یاد ہے۔ ہم بیچاری لڑکیاں بہت دیر تک آتش دان کے قریب بیٹھی روتی رہی تھیں۔ اس شام "کوہ نیل" سے ہمارے پاس کوئی نہیں آیا۔ اسی وقت بوڑھی زدناش نے کھانے کی اطلاع دی۔ چونکہ ڈاکٹر گار بہت مضمحل ہو رہا تھا۔ اس لئے اس نے کھانا اپنے کمرے ہی میں کھالیا۔ ہم دونوں چپ چاپ کھانے لگیں۔ چراغ کی روشنی مدھم تھی۔ اور ہر طرف ایک افسردگی برس رہی تھی!

اُلّو

حکمائے یونان کی طرح تو سر جھکائے کیا سوچ رہا ہے؟

ویران رستوں پر
اور اُجڑے ہوئے کھنڈروں میں
تو تنہا بیٹھا کس چیز کو تک رہا ہے؟

شاید زندگی کی روشنی کو!

تو شہروں کی آبادیوں سے دور۔ خاموش فضا میں کسی ایک

چیز کی جستجو میں گم ہو گیا ہے ✣
آخر کس چیز کی جستجو میں ؟

ر شاید روح کی عظمت میں۔

تو کائنات کی تشدد پسند آوازوں سے علیحدہ۔ ویران جھاڑیوں
میں بیٹھا کسی خاص آواز کو سُن رہا ہے ؟
مگر کس آواز کو ؟

ر شاید ضمیر کی آواز کو !

سنسان اور شکستہ دیواروں سے تجھے عشق ہے ✣
دنیا اور اس کی بے رحم آبادیوں سے تجھے نفرت ہے ✣
اور
زندگی اور اس کی اُلجھنوں سے مجھے وحشت ✣
اس لئے آ ۔ ۔ ۔ اے میرے رفیق !
ہم وہاں جائیں۔ جہاں تیرے لئے دل بستگی ہے ۔ اور

میرے لئے دل چسپی۔ جہاں کی فضا تیرے لئے فلسفیانہ ہے۔
میرے لئے شاعرانہ!

قبروں کے شکستہ پتھروں کے شیدائی! آ۔۔۔
ہم اس سنسان راستہ پر زندگی کی کھوئی ہوئی کرنوں کو
ڈھونڈیں ٭
روح کی گم شدہ مسکراہٹوں کو پالیں ٭

آ۔۔۔ اے میرے رفیق آ!۔۔۔
تیری بڑی بڑی اور گول آنکھوں اور وحشت زدہ دیدوں
میں مجھے فلسفہ زندگی کا ایک دریا لہریں مارتا نظر آرہا ہے ٭
تیرے ویران گیت میں مجھے الوہیت کی آواز سنائی دیتی
ہے ٭
جو مخلوق کو نصیحت کرتی ہے ٭
اور زندگی کے طریق بتاتی ہے ٭
اور جو آنے والے واقعہ کو انسان کے ذہن نشین کرتی
ہے ٭

یعنی موت کی حکایت بیان کرتی ہے ٭

اس لیے ویران راتوں میں گا ٭

تاکہ میں تیری آواز میں اسرارِ الٰہی کے سربستہ راز سُن سکوں ٭

عورت بحیثیت ماں کے

زندگی کی شاہ راہ پر کتنے ہی ایسے دوست ہیں۔ جو روزانہ ہم سے ملتے جلتے اور ہم سے دوستانہ گفتگو کرتے ہیں۔ کتنے ہی ایسے رفیق ہیں۔ جن کی زبان ہم سے اظہار محبت کرتے خشک ہو جاتی ہے۔ مگر ان میں سے کتنے ایسے ہیں۔ جن کی آنکھ ہماری مصیبتوں کو دیکھ کر آنسو سے لبریز۔ اور جن کے دل ہمارے درد پر بے صبری سے تڑپ اٹھتے ہیں؟ . . . شاید ایک بھی نہیں زندگی کے اس تھکا دینے والے طویل سفر میں روزمرہ کے ملنے جلنے والوں میں سے شاید ایک بھی ایسا نہ نکلے جس کی رفاقت ہمارے لیے سایہ کا کام دے سکے۔ جس کی محبت و شفقت

کے تکئے پر ہماری بے فکریاں اطمینان سے سر رکھ کر مسکرا سکیں۔ جو کارزار حیات میں ہمارے لئے ڈھال کا کام دے + ہائے! کس قدر حوصلہ شکن اور کتنا تکلیف دہ احساس ہے۔ کہ یہ وسیع دنیا۔ یہ اتنی بڑی کائنات مخلص اور دردمند دوستوں سے خالی ہے!

یہ مسکرانے والے۔ قہقہے لگانے والے دوست محض ایک خیالی تصویر کے رنگین کیرکٹر ہیں۔ جن کو حقیقت سے دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔

"خیر خواہ آج زمانے میں کہاں ملتے ہیں؟
ہے یہی لاکھ غنیمت کوئی بدخواہ نہ ہو"+

کسی نے ایک دفعہ رسول اللہ صلعم سے سوال کیا تھا۔ کہ دنیا میں کس کو سب سے زیادہ پیار کروں؟ آپ نے فرمایا "اپنی ماں کو"+ اس شخص نے پھر وہی سوال کیا۔ کہ کس کو پیار کروں؟ آپ نے وہی جواب دہرا دیا۔ کہ "اپنی ماں کو" + اس شخص نے تیسری دفعہ پوچھا۔ اور آپ نے تیسری دفعہ بھی وہی جواب دہرا دیا +

ویسے تو ادب و شاعری کی دنیا عورت کی بے مثال محبت

اور ایثار کے اعتراف سے بھری پڑی ہے۔ مگر پیغمبر صلعمؐ نے عورت کو بحیثیت ماں کے انسان کا بہترین دوست قرار دیتے ہوئے فرمایا تھا۔ کہ جنّت ماں کے قدموں کے نیچے ہے + اور آج یہ ضرب المثل دنیا کی تقریباً ہر زبان میں رائج ہو چکی ہے۔ آخرت تو دور کی بات ہے۔ زندگی ہی میں کبھی نہ کبھی آپ نے محسوس کیا ہوگا۔ کہ اس کی بے لوث محبت میں جنّت کا سا لطف محسوس ہوتا ہے ❊

اُن ایام کو یاد کیجئے۔ اپنے ماضی کو گردن موڑ کر دیکھئے۔ ماں کی محبت کا ایک دریا لہریں مارتا نظر آئے گا۔ وہ سنہرے خواب! وہ بچپن کا زمانہ! اور اس میٹھے خواب کی دل فریب تعبیر ماں اور اس کی محبت کو یاد کیجئے + جب آپ محض ایک مضغۂ گوشت تھیں۔ جب نہ آپ دنیا کے ناہموار راستوں سے واقف تھیں۔ نہ زندگی کے معنے سمجھتی تھیں۔ ایسے وقت میں ماں نے آپ کو انسانیت اور زندگی کے دروازے پر پہنچایا۔ آپ کو کیا پتہ اس رہبری میں اس کو کیسی کیسی دقتیں پیش آئیں ❊

کیا وہسلر کی بنائی ہوئی وہ زندۂ جاوید تصویر آپ کی نظر سے گذری ہے۔ جس میں اس نے اپنی ضعیف ماں کو ایک

کمرے کی خاموشی اور تنہائی میں مادرانہ شفقت کی پاکیزگی کا نور پھیلاتے ہوئے دکھایا ہے؟

آپ کو شاید یاد ہو۔ نپولین نے بھی اپنی زندگی کی تمام کامرانیوں اور عظیم الشان کارناموں کی وجہ اپنی ماں کی ہستی قرار دی تھی۔

میٹرلنک اپنے ایک نئے کھیل میں ایک جگہ لکھتا ہے:۔

دنیا میں نہ تھکی ہوئی مائیں ہیں۔ اور نہ بوڑھی مائیں۔

اور نہ اداس غمگین مائیں۔"

واقعی مہر مادری کو نہ عمر کی کوئی مدت ضعیف بنا سکتی ہے نہ اس کی شفقت کو حادثات وصدمات ملول بنانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اس کی خدمت گزاری تکان کے لفظ سے نا آشنا ہے۔

مگر آہ . . . جب یہ نورانی تصویر گم ہو جاتی ہے۔ جب ہماری زندگیوں پر سے یہ مبارک سایہ اُٹھ جاتا ہے۔ تو ہم زندگی کے اُداس راستے پر اس اندھے فقیر کی طرح جو برسات کی کالی اور اندھیری رات میں اپنی بے نور آنکھوں کو لئے شہر کی کسی ہولناک گلی میں تھک کر رہ جاتا ہے۔ مایوس کھڑے ہو جاتے ہیں!

اس لئے . . . اس کو پوجو۔ اس کی پرستش کرو۔ اس

کے سفید بالوں۔ اس کے ضعیف ہاتھوں۔ اس کی دھندلی نگاہوں کی پرستش کرو۔ جس کے پاس تم اپنے بچپن کی چھوٹی الجھنیں لے کر جاتی تھیں۔ جوان ہو کر اس کی قدر کرو۔ آج یہ تمہاری بے پرواہیوں۔ بے توجہیوں کا تختہ مشق بنی ہوئی ہے۔ آج اس کی نصیحتیں سُن کر تمہاری ابرو پر شکن آ جاتی ہے۔ آہ۔ کیا پتہ۔ کوئی دن ایسا آئے۔ جو ہمیشہ کے لئے اسے تم سے چھین لے جائے۔ پھر تم اس کی محبت ہی کو نہیں۔ اس کی خفگی ہی کے لئے ترس جاؤ۔ اس کی نصیحتوں کو یاد کر کے رونے لگو۔ کیا پتہ آنے والا دن کس دوست کو کس سے جدا کر دے!

ابّا جان کی گھڑی

رہبرِ نسواں شمس العلما مولوی سیّد ممتاز علی صاحب کے انتقال پر

وہ صبح۔ اے اللہ! وہ ملول روشنی کی مرجھائی ہوئی صبح!
سب کچھ ہو چکا تھا۔ ابّا جان کا تابوت دیوبند کا راستہ طے
کر رہا تھا۔۔۔ اپنی یاد اپنی روح۔ اپنے پرانے مکان میں
مکان کے قدیم کمروں میں۔ مکان کے ہر گوشے میں چھوڑ کر۔
۔۔۔ ان کا نحیف اور علالت کی صعوبتوں سے مرجھایا ہوا جسم ہر
لمحہ لاہور سے دور ہو رہا تھا۔

گھر کے لوگ غم و اندوہ سے نڈھال موت کے گئے پہ
دلریش کوئی صحن میں۔ کوئی کمرے میں سر جھکائے چُپ چاپ

تھے۔

دیواروں پر ناتواں دھوپ سسک رہی تھی۔
صحن کے درخت جیسے کھوئے ہوئے کھڑے تھے۔ شاید ماضی کی یاد میں محو! گرمیوں کی ان اُداس شاموں کی یاد میں محو!
جب ان کے فکرمند سایوں سے بہت قریب بیمار کا پلنگ بچھا کرتا تھا۔

وہ پلنگ اب بھی بچھا تھا۔ اب بھی۔ مگر ہائے! اک سنسان کمرے میں۔ اجڑا ہوا پلنگ! جس کی شکنوں میں سے موت کا دردناک سایہ اب تک نہ اٹھا تھا۔
اس خاموش اور دردناک بستر پر ایک شئے کس قدر نمایاں معلوم ہو رہی تھی!
ابّا جان کی گھڑی!
اس کی سوئیاں اب تک برابر حرکت کر رہی تھیں جیسے اک جنون کی کیفیت میں اپنا چکر کاٹے جا رہی ہوں۔
میں نے اسے اٹھا لیا۔ اور میری آنکھیں آنسوؤں میں سے دیر تک اس کی سوئیوں کو چلتا ہوا دیکھتی رہیں۔ جن ہاتھوں نے اسے کوک دی اور زندگی کی رفتار بخشی تھی۔ وہ تابوت میں سرد

اور ساکت پڑے تھے۔ مگر یہ اب تک چل رہی تھی۔ اس میں لرزشِ حیات اب تک باقی تھی۔

میں اسے کان کے قریب لے گئی۔ وہ ٹک ٹک کئے جا رہی تھی۔ اداس ٹک ٹک! جیسے موت کے جزیرے میں کسی ملول فرشتے کی آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے ہوں۔

میں اسے دیکھتی رہی۔ موت کے دھندلکے میں سے زندگی کے دل فریب نقش پھر ابھرنے لگے۔ ابا جان کے ہاتھ اسے کوٹ کی اوپر کی جیب میں سے نکالتے ہوئے دکھائی دینے لگے اس کا وقت دیکھتے ہوئے۔ اور پھر اسے اپنے مقدس سینے سے لگاتے ہوئے۔ اپنی جیب میں واپس رکھتے ہوئے۔

بچاری گھڑی! اپنے مالک سے بچھڑ گئی۔ اور زندہ ہے۔ اُسی کی دی ہوئی کوک سے زندہ!

آج بھی ... آج اتنے دن گذر جانے کے بعد بھی ... مجھے ابّا جان کی دردناک یاد کے ساتھ ان کی گھڑی یاد آ جاتی ہے۔ موت کے بستر پر پڑی ہوئی! اک معصوم بچے کی طرح، جو اپنی ماں سے بچھڑ گیا ہو۔ اور اپنی بدبختی کے معنے نہ سمجھ سکتا ہو مگر پھر بھی اداس ہو۔

میں سوچتی ہوں۔ اس گھڑی کی ٹک ٹک میں ضرور ایک پیام ہے۔ اک بے جان شئے کو مرحوم کے ہاتھوں کی کوک ان کے بعد بھی چلاتی رہی۔ انسانی زندگی کی چابی ختم ہو گئی۔ مگر اس کی کوک باقی رہی۔ اسی طرح خدا کرے۔ ابا جان کی جو امیدیں اور تمنائیں ہم لوگوں سے وابستہ ہیں۔ وہ بھی زندگی کا سانس لیتی رہیں اور ان کے بعد بھی اسی طرح زندہ رہیں جس طرح یہ گھڑی... یہ ننھی سی بچاری گھڑی!

عورت کی سوانح عمری

کیا صوفیان باصفا۔ کیا عازمانِ باخدا
کیا انبیا۔ کیا اولیا۔ کیا غوث۔ کیا قطب زماں
سرکار سے مالک کے جتنے پاک بندے ہیں بڑھے
وہ میری ہی گودوں کے زینے سے ہیں سب اوپر چڑھے

(حالی)

تاریخ کی انگلیاں شمار کر کے اندازہ لگانے سے قاصر ہیں۔
کہ میری دشمنی اور میری توہین و تحقیر پر دنیا نے کب سے کمر باندھی
میرا خیال ہے۔ کہ روز ازل سے میرے بچوں نے میری بربادی
کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جبھی تو مجھ پر اتنا بڑا اور جھوٹا الزام لگا دیا۔ کہ آدم

کو جنت سے میں نے نکلوایا تھا۔

حالانکہ میں جنت میں آدم کے پہلو میں چپ چاپ کھڑی تھی۔ آدم کو شیطان نے بہکایا تھا۔ اور غالباً شیطان عورت نہ تھا۔ آدم بھی مرد تھا۔ مرد جسے اپنی عقل پر بڑا ناز ہے۔ تو پھر کیوں اس عاقل پر میرا جادو چل گیا؟ مرد کیوں میرے اشارے پر اتنی بڑی غلطی کا مرتکب ہوا؟ بالفرض یہ مان بھی لیا جائے۔ کہ میں نے اسے بہکایا تھا۔ اور جنت سے نکلوایا تھا۔ تو پھر آدم کے بیٹوں کی عقل و فراست کی حقیقت معلوم۔

خیر۔ اگر میرے دامن پر صرف آدم کو جنت سے نکلوانے ہی کا داغ ہوتا۔ تو میں صبر کر لیتی۔ میں نے صدیوں صبر کیا۔ مگر اب میری آہ میرے قابو سے باہر ہے۔ میں نے دنیا میں وہ وہ دکھ اٹھائے ہیں۔ کہ اگر اب بھی یونہی خاموش رہ گئی۔ تو وہ دن دور نہیں۔ کہ میری احسان فراموش نافرمان اولاد صفحۂ دہر سے میری ہستی کو حرف غلط کی طرح معدوم کر دے۔ میں نے صدیاں اس امید میں بسر کیں۔ کہ خود غرض مرد شاید کبھی اپنی غلطی محسوس کرے۔ مگر آہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا۔ ویسے ویسے مجھ پر نت نئے ستم توڑے گئے۔ میں نے بہت ضبط کیا۔ مدتوں اُف نہ کی۔

کی میں نے اس دارالمحن میں جس تحمّل سے بسر
زیبا ہے گر کہئے مجھے فخر بنی نوع بشر

مگر میرے اس صبر ایوب کا نتیجہ مجھے یہ ملا۔ کہ تم نے میری زندگی کی فطری آزادیوں۔ میرے جائز حقوق اور میری ان تمام نعمتوں کو مجھ سے جبراً چھین لیا۔ جو اس برگزیدہ شخص نے مجھے عطا کی تھیں۔ جو ریگستان عرب میں آج سے کئی سال پیشتر ماہتاب بن کر طلوع ہوا تھا۔ صرف یہی نہیں کیا۔ بلکہ میری زندگی اجیرن کر دی۔ مجھے اپاہج کر دیا۔ مجھے زنجیروں میں جکڑ کر قانون فطرت کے سراسر خلاف چار دیواری میں مقید کر دیا۔ اور اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ کافروں کی طرح جو جھوٹ بولنے کے عادی ہیں۔ میرے آگے جھوٹ کہنا شروع کیا۔ کہ خدا نے عورتوں کو زمین پر اس لئے بھیجا ہے۔ کہ وہ دنیا میں قید محض کی مصیبتیں جھیلیں۔ اور غلامی کی لعنت کا طوق گلے میں پہنیں ؛

مگر اب وقت آگیا ہے۔ کہ تمہارے جھوٹ کا طلسم کھل جائے چنانچہ وہ کھل چکا ہے۔ آج میں اپنی صدیوں کی نیند سے آنکھیں ملتی ہوئی بیدار ہو چکی ہوں۔ آج میں نے تمہارے فریب کو پہچان لیا۔ آج میں نے غلامی کی زنجیریں توڑ ڈالیں۔ میں نے مجرموں کی

طرح چہرہ چھپانا اپنے خلاف شان سمجھا۔ اور تمہارے دئے ہوئے نقاب کی دھجیاں کر ڈالیں۔ آج میں تمہارے سامنے اس لئے آئی ہوں۔ تاکہ تم پر اچھی طرح جتا دوں۔ کہ اب مجھ پر تمہارا جادو نہیں چل سکتا تمہاری حکومت کے دن گئے۔ اب یہ مرا زمانہ ہے۔

اب تو میرا جی یہ چاہتا ہے۔ کہ میں تم پر وہ سب ظلم روا رکھوں جو مدتوں تم مجھ پر کرتے رہے ہو۔ مگر نہیں میں اپنے سینے میں ماں کا دل رکھتی ہوں۔ جو محبت اور انصاف کے خمیر سے بنا ہوتا ہے۔ البتہ اک بات میں تم پر اچھی طرح واضح کر دینا چاہتی ہوں وہ یہ ہے کہ میں تم سے کسی طرح کمتر نہیں۔ کمتر ہونا ایک طرف رہا ہر اعتبار سے تم سے برتر ہوں۔ تم ناک بھوں کیوں چڑھاتے ہو؟ ذیل میں میں وہ سب دلیلیں پیش کروں گی۔ جنہیں سن کر تم اگرچہ قائل ہونا تو پسند نہ کرو گے۔ مگر انگشت بدنداں ضرور رہ جاؤ گے۔

کیا تم مجھ پر اپنی فوقیت جتا کر پروردگار کو جھٹلانا چاہتے ہو؟ ذرا آنکھیں کھول کر پڑھو۔ کہ سورۂ بقر میں مالک نے کیا فرمایا ہے:

(هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۵-۲۳ع بقر۲)

(عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم عورتوں کا لباس ہو)

اللہ پاک نے عورت اور مرد کے متعلق جو مثال لباس سے

دی ہے۔ اس سے بہتر دوسری مثال ہو ہی نہیں سکتی۔ دو جدا
چیزوں میں قربت اور ساوات کے لحاظ سے جسم اور لباس سے
زیادہ موزوں مثال نہیں ہو سکتی۔ اگر خالق نے عورت کو مرد کا
لباس قرار دیا ہوتا۔ تو اس تمثیل اور اس تعلق میں مساوات نہ ہوتی
ادنےٰ۔ اعلےٰ۔ کمتر اور برتر۔ بدتر اور بہتر کی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتیں
مگر قرآن مجید کے اس کھلم کھلا مساوات کی ہدایت کے باوجود
تم نے اپنے آپ کو عورت کا حاکم سمجھ لیا۔ اور مجھ پر خود ساختہ منفعت
کی قید کی مصیبتیں عائد کیں۔ اور آپ کی عقل کے قربان جایئے
کہ اینٹ اور چونے کی کمزور دیواروں کو میری عصمت اور پاک
دامنی کا محافظ قرار دیا۔ اور اس طرح مجھے چار دیواری میں مقید
کر کے تم باہر گلچھرے اُڑاتے رہے۔ آہ تمہارے گناہوں کی
حد ہو گئی! حالانکہ ہمارے معبود نے حیا۔ شرم اور عصمت میں مرد اور
عورت دونوں کی ذمہ داری یکساں قرار دی ہے۔ ایک کو بے
مہار آزادی۔ اور دوسرے کو بے حد پابندی نہیں دی۔ اس لئے
دونوں کو بیک وقت حکم ہوا۔ "کہ اپنی نظریں نیچی رکھو"۔

یہ تو ہوئی۔ میری تمہاری مساوات کی کہانی۔ اب میں تم
پر ان باتوں کا اظہار کرنا چاہتی ہوں۔ جنہوں نے مجھے تم سے محروم

ممتاز کر دیا ہے۔ وہ میرے بے نظیر ایثار اور میری عدیم المثال وفا کی داستان ہے۔ میرے تحمل و ایثار کی کہانی مشرق سے لے کر مغرب تک پہنچتی ہے۔ خواہ میں مشرقی حرم کی نقاب پوش دوشیزہ ہوں۔ خواہ مغربی رقص گاہ کی پری۔ میری فطرت کبھی نہیں بدلتی۔
میرا ایثار اس وقت سے شروع ہوتا ہے۔ جب میں ایک لڑکی کا جنم لے کر دنیا میں آتی ہوں۔ اور اس وقت ختم ہوتا ہے۔ جب میرا رشتۂ حیات اس دنیا سے منقطع ہوتا ہے۔ اور یہ تو تم سنتے ہی جانتے ہو گے

آتی ہوں اکثر بے طلب دنیا میں جب آتی ہوں میں۔
پر موہنی سے اپنی یاں گھر بھر پہ چھا جاتی ہوں میں۔

ہندوستان کے علما میرے نزول پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ اور نفرت کے نعرہ ہائے دل خراش بلند کرتے ہیں۔ تو عرب کے دانا مجھے جیتا جاگتا زمین میں دفنا دیتے ہیں۔ حد ہو گئی میری مظلومیت کی۔ اور تمہارے ظلم کی! اگر یہ سوال پیش کیا جائے کہ دنیا میں تم زیادہ گنہگار ہو یا نہیں۔ تو سینے پر ہاتھ رکھ کر کہو اس کا کیا جواب دیا جائے گا؟ تم نے مجھے لوح ہستی سے مٹا دینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ یہ تو میرے بچپن کا ذکر ہے۔ مگر جونہی

میں جوان ہوئی۔ والدین مجھے اپنی مصلحتوں کے دوزخ میں دھکیل کر مجھ سے سُبک دوش ہو گئے۔ مَیں نے اُف نہ کی۔ مَیں نے دنیا کے ظلم وستم کے معاوضے میں دنیا کو ہمیشہ محبت کے جام پلائے جس شوہر کے ساتھ میں نے دنیا میں جہنم کی زندگی بسر کی۔ اس کی موت پر بھی میں نے کہیں آگ کے شعلوں میں کود کر جام اجل پیا اور کہیں اپنی محرومی کو سفید چادر سے ڈھانپ کر دنیا کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں۔ عورت کا دل محبت کا وہ آتش کدہ ہے جو کبھی ٹھنڈا نہیں ہوتا۔ آہ کیا میرے اسی ایثار اسی وفاداری نے تمہیں شیر بنا دیا؟

یہ تو میری ابتدائی زندگی کے تحمل وایثار کی معمولی مثالیں تھیں۔ میرے ایثار کی اصل شاہکار داستان اس وقت سے شروع ہوتی ہے۔ جب میں دنیا میں ایک بچے کو لانے کا سبب بنتی ہوں۔ میں اپنی زندگی کی بھینٹ چڑھا کر ایک انسان کو اس جیتی جاگتی دنیا میں لا کھڑا کرتی ہوں۔ پھر اس کی پرورش اور نگہداشت میں مجھے کیسی کیسی قربانیاں نہیں کرنی پڑتی ہیں؟ اس کا غالباً دنیا کو احساس نہیں ... بعض اوقات مجھے اس ننھے سے انسان کے پروان چڑھانے میں اپنی جان تک گنوا

دینی پڑتی ہے۔ مگر مجھے اس کا افسوس نہیں ہوتا۔ میں بخوشی ان تمام مصائب کو قبول کرتی ہوں۔ لیکن آہ میری ان تمام قربانیوں میری ان تمام ایثار نفسیوں کا مجھے کیا صلہ ملتا ہے؟ آہ خدا دشمن کو بھی اس کے صبر اور محنت کا ایسا غمناک معاوضہ نہ دے۔ عورت کا یہ لخت جگر یہ ظالم احسان فراموش بچّہ . . . . مرد۔ میرے آغوش محبت میں پروان چڑھ کر میری محنتوں کے طفیل جب انسان کہلانے کا مستحق بنتا ہے۔ تو مجھ سے اپنے سبب حیات سے اپنی ماں سے منحرف ہو جاتا ہے۔ وہ شوہر بھائی یا باپ بن کر میرے حقوق چھیننے کی کوشش کرتا ہے۔ آہ احسان فراموش اولاد میری گنہگار اولاد!

تم نے زندگی کی ہر منزل پر میرے راستے میں روڑے اٹکائے۔ ہر ہر طرح میری مخالفت کی تم نے بزدلی اور کم ہمتی کو مصلحتاً میری نسوانیت کا ایک ایسا جزو قرار دے دیا ہے۔ کہ اس بہانے سے اندھا دھند میرے حقوق مجھ سے چھیننے لگے۔ جب میں سیاسیات میں دخل دینا چاہتی ہوں۔ جب میں تمدنی اصلاح کا بیڑا اٹھانے کو کھڑی ہوتی ہوں۔ جب میں ایک ریفارمر و مصلح کی حیثیت سے بے نقاب ہو کر تمہارے دوش بدوش کام کرنا

چاہتی ہوں۔ تو تم فوراً میری کمزوری کا ذکر کرتے ہو۔ میرا نازک جسم دیکھ کر تم سمجھتے ہو۔ کہ میرا دل و دماغ بھی ایسا ہی کمزور ہے۔ حالانکہ تم کو بخوبی معلوم ہے۔ کہ میں کسی بات میں کسی شعبے میں تم سے پیچھے نہیں ہوں۔ اور تم کسی حیثیت سے مجھ سے ممتاز نہیں ہو۔

اگر حسد نے تمہاری آنکھوں کو اندھا اور تعصب نے تمہارے کانوں کو بہرہ نہیں کر دیا۔ تو آؤ۔ میں اپنی کتاب زندگی کے اس باب کو تمہارے آگے دہراؤں۔ جو بزدلی کے اس وہم کو تمہارے دماغ سے محو کر دے گا۔ اور تم اپنی شجاعت پر اترانا چھوڑ دو گے۔

جنگ یرموک کی فتح کا قصہ اتنی جلدی تم نے بھلایا نہ ہو گا۔ اس کی نصرت کا سہرا کس کے سر رہا؟۔ تم۔ مرد۔ جنہیں اپنی شجاعت پر بڑا زعم ہے۔ اس وقت میدان کارزار میں پیٹھ دکھا کر بھاگ اٹھے تھے۔ میں اس وقت "ہندہ" بن کر تمہیں غیرت اور شرم دلانے آئی۔ اور اس طرح میرے ہی نام پر جنگ یرموک کی فتح ہوئی۔

میں نے تمہیں اس وقت شرم اور غیرت ہی نہ دلائی۔ بلکہ تمہارے ساتھ جنگ میں موت دست بدست بھی شریک ہوئی۔ میں نے مالک بن عاصم کی بیٹی کعصوب کی صورت میں زرہ بکتر کے بغیر صرف ایک چوبی ستون سے داد شجاعت دی تھی۔

اسی جنگ میں کبھی سلمہ بن لوئی بن عاصم بن کر صفیں الٹ دیں کبھی سلمہ بنت طلحۃ الزبیدی بن کر لشکر کو حیران و ششدر کر دیا۔

نور جہاں بن کر شیر افگنی میں نام پیدا کیا۔ اور جب شاہ جہاں اور مہابت خاں کے دام میں شہنشاہ جہانگیر گرفتار ہو گیا۔ تو نور جہاں کے بھیس میں اپنے شوہر کے حریف کا سیاست سے مقابلہ کیا۔

فرانس کی روح رواں جون آف آرک بن کر میں نے اپنے ملک و قوم کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کے لئے اٹھارہ برس کی عمر میں آگ کے شعلوں میں اپنی جان کھو ڈالی۔

۱۹۱۱ء کے انقلاب چین کا واقعہ یاد کرو۔ میں بزم سے نکل کر تمہاری مدد کے لئے رزم میں پہنچی تھی۔ اور دنیا پر ثابت کر دیا تھا کہ عورتیں ابھی زندہ ہیں۔ اور اب چین کسی سے دب کر نہ رہے گا۔

ابھی حال میں میں نے صحرائے اعظم کا تن تنہا ہوائی سفر کر کے نسوانی جرأت اور دلیری کی ایک ایسی زندہ مثال قائم کر دی ہے۔ جس پر میرے دشمن بھی عش عش کرنے لگے۔

تم بھولے نہ ہو گے۔ ابھی کل کی بات ہے۔ ٹرکی کے اس بہادر فرزند اور مسلمانوں کے مایہ ناز غازی مصطفٰے کمال نے مجھ سے

استدعا کی تھی۔ کہ میں اس کی فوج کے پست ہمت نوجوان سپاہیوں میں جنگجوئی اور مردانگی کی روح پھونک دوں۔ چنانچہ میں خالدہ بن کر صفوں میں گھس گئی۔ اور فوج کے آگے ایسی پرجوش اور مؤثر تقریر کی۔ کہ سپاہی تھرّا اُٹھے۔ شجاعت نے ان کے چہروں کو سرخ کر دیا۔ اور اس طرح میں نے صرف ایک دن میں چودہ ہزار نوجوانوں کو پُرجوش سپاہی بنا کر فوج میں داخل کرا دیا۔

یہ صرف چند واقعات ہیں۔ جنہیں میں نے ڈھونڈ کر نہیں نکالا اور سوچ کر ترتیب نہیں دیا۔ تم نے مجھے بے دست و پا بنائے رکھنے کی پوری کوشش کی۔ لیکن دیکھو باوجود تمہاری کوششوں کے تاریخ کے صفحات میرے بے شمار زریں کارناموں سے خالی نہ رہ سکے۔ کیا پھر بھی تمہیں اپنی برتری پر زعم ہے؟ کیا اب بھی تمہیں اپنی فوقیت کا دعوے ہے؟ یہ تو ہوئیں میری شجاعت اور ہمت کی مثالیں۔ اب ذرا اپنے ظلم و جور اور میری الفت و وفا کی دلریش کہانی بھی سن لو۔

رانی سیتا بن کر میں نے رام چندر جی کے ساتھ چودہ برس بیابانوں کی خوفناک زندگی بسر کی۔ مگر اجدھیا میں ان کی واپسی پر محض دنیا کی چہ میگوئیوں پر محلوں سے بن باس کو بھیج دی گئی۔

اور میری عفت کی وہ خوفناک آزمائش بھی جو میں نے آگ کے شعلوں میں اتر کر دی۔ مجھے اس ناروا سزا سے نہ روک سکی۔
مشرق کے مشہور قصہ کو یاد کرو۔ نل نے کسی بے دردی سے مجھے جوئے میں ہار دیا۔ اور میں نے اُف تک نہ کی۔
تم ہزار بھولنا چاہو۔ مگر نہیں بھلا سکتے۔ کہ نپولین نے بادشاہ بن کر کس بے دردی سے میری گہری الفت کو سیاسی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا۔ مگر پھر بھی میری وفا شعاری نے نپولین کی محبت کا دامن نہ چھوڑا ؎

گو صبر کا اپنے نہ کچھ مجھ کو ملا انعام یاں۔
پر جو فرشتہ سے نہ ہو۔ وہ کر گئی میں کام یاں

تمہاری نفس پرستی اور ظلم سے مجھے ڈر لگتا تھا۔ اس لئے میں پدمنی بن کر اپنی عصمت کی حفاظت میں آگ میں کود پڑی۔
میری وفاداری۔ میری ایثار نفسی اور میری عصمت کے قصے پیغمبروں سے پوچھو۔ نبیوں سے دریافت کرو اور پھر ایک بار صرف ایک بار اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر اپنے اعمال کو بھی دیکھو۔
عرب کا وہ مشہور برگزیدہ انسان جو دنیا کا سب سے بڑا پیشوا ہے

اپنی محبوب بیوی خدیجہ کے اوصاف سے متاثر اور بیتاب ہو کر اعتراف کرتا ہے:

"دنیا میں مجھے تین چیزیں محبوب ہیں۔ عبادت عورت اور خوشبو":

اُس معجزے کو یاد کرو! معبود نے مجھے برگزیدہ کیا اور عیسےٰ اتنا بڑا نبی میرے پہلو سے نکلا صحرا میں سلمانوں کا جو چاند چمکا۔ اس کی کرنیں بھی میرے ہی مبارک پہلو سے نمودار ہوئی تھیں۔ مجھی تو بحر و بر کے مالک۔ زمین و آسمان کے مختار ہمارے اور تمہارے معبود نے۔ میری عظمت اور میرے اخلاق سے خوش ہو کر میرے قدموں کے نیچے جنت رکھ دی۔ اس سے زیادہ اور میری برتری کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے؟

سرورِ کائنات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عورت کی تعظیم میں اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ ایک بے تعصب مرد عالم نے کہا ہے "عورت انسان اور فرشتہ کے درمیان ایک پاکیزہ مخلوق ہے":

ایک مشہور فلاسفر کا مقولہ ہے "ایک طرف سے عورت آ رہی ہو۔ اور دوسری طرف سے شہنشاہ۔ تو شہنشاہ کا فرض ہے کہ

وہ ایک طرف کو ہٹ جائے۔ اور پہلے عورت کو راستہ دے دے"۔

کسی نے یہ حقیقت کھول کر کتاب میں رکھ دی ہے "آدم مٹی سے بنے تھے اور حوّا گوشت سے آدم فضا میں پیدا ہوئے تھے اور حوّا جنت میں" *

مشرق کا مشہور شاعر حالی کہتا ہے:۔

کہ دنیا کی عزت صرف عورتوں سے ہے یہ ملکوں کی آبادیاں ہیں اور غمگین دلوں کی شادیاں !"

وہ دنیا کا سب سے پہلا مرد ۔ ۔ ۔ آدم ۔ ۔ ۔ اس نے جنت کے ہوش ربا گلستانوں میں میرے بغیر تنہائی محسوس کی تھی۔ اور میرے لئے گڑگڑا گڑگڑا کر معبود سے دعائیں مانگی تھیں۔ تب کہیں میں رحمت الٰہی کی طرح اس کی رفیق حیات بننے کو آئی *

سنو! پیغمبران عالم نے جس وجود کی تعظیم کی۔ مشاہیر جہاں نے جس وجود کے آگے سر تسلیم خم کیا۔ پروردگار نے جس کی عزت بڑھائی۔ وہ ذی شان ہستی تمہارے آگے اپنے حقوق کی طلبی میں ہاتھ پھیلاتی رہی۔ اور تم اسے ٹھکراتے رہے!

کیا تمہیں کبھی خیال نہیں آتا۔ کہ تم اپنے اس ظلم و ستم اور خود غرضی و سنگ دلی کے ساتھ ہر روز یوم الحساب سے قریب تر

ہو تنے چلے جا رہے ہو؟